
دادا، چوزی اور موذی
علیم الحق حقی

تجربات، مشاہدات، تخیّل اور جیتے جاگتے کرداروں
سے سجّی ایک اثر انگیز تحریر

دادا، چوزی اور موذی

علیم الحق حقّی

ناشر
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور ۲۔ فون: ۷۶۶۸۹۵۸

کانوں میں مخصوص گدگدی ہوئی تو مرزا صاحب نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ انہوں نے سر گھما کر دیکھا تو توقع کے عین مطابق چھوٹو کو اپنے سر پر موجود پایا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ روز کان میں گدگدی ہوتے ہی وہ ہنستے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے لیکن آج معاملہ مختلف تھا۔ وہ جھنجلا گئے۔ "سونے دو چھوٹو۔۔۔ تنگ نہ کرو۔" انہوں نے تلخی سے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیند گہری ہونے کے مرحلے میں ہی تھی کہ کانوں میں پھر گدگدی ہوئی۔ اس بار انہیں غصہ آ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گے۔ "میں نے منع کیا تھا نا۔۔ پھر بھی باز نہیں آتے تم۔۔ کیا بات ہے' پٹائی چاہتے ہو؟"

چھوٹو کی نگاہوں میں انہیں حیرت نظر آئی۔۔ گویا وہ ان کی بات سمجھ رہا تھا۔ اس پر انہیں حیرت ہوئی۔۔۔ جنہیں بولنا ہی نہیں آتا' وہ دوسروں کی بات کیسے سمجھ لیتے ہیں۔

پھر چھوٹو ان کے ہاتھ پر گدگدی کرنے لگا۔

انہیں ایک دم ہی اس پر پیار آ گیا۔ وہ اس کا سر سہلانے لگے۔ "تم تو اپنی عادت کے پکے ہو۔" ان کے لہجے میں محبت اور شکایت گھل مل رہی تھی۔ "صبح سویرے اٹھ جاتے ہو اور دادا سے کیونکہ تمہیں خاص محبت ہے اس لئے جاگنے کے بعد ان کا سونا تمہیں ایک لمحے کیلئے گوارا نہیں ہوتا۔ تم چاہتے ہو کہ بس ان کے ساتھ ساتھ پھرتے رہو' یہی بات ہے نا۔"

چھوٹو کی آنکھوں کی چمک نے انہیں اثبات میں جواب دے دیا۔ اس قسم کی

گفتگو کے دوران میں وہ چپ ہی رہتا تھا۔ اس کے منہ سے نہ کوئی بامعنی آواز نکلتی تھی نہ کوئی لایعنی آواز۔ بامعنی آوازیں تو وہ اب پہچاننے بھی لگے تھے۔

"تمہارا مطالبہ اپنی جگہ لیکن آج مجھے نیند کی ضرورت ہے۔" انہوں نے چھوٹو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "رات بھر میری داڑھ میں شدید تکلیف رہی ہے۔ یہ داڑھ کا درد نیند کا تو دشمن ہے۔ اب تمہیں میں کیسے سمجھاؤں تم صرف سوا دو ماہ کے ہو۔ منہ میں دانت ہے نا داڑھ۔ داڑھ کے درد کو تم کیا سمجھو' بس یہ سمجھ لو کہ اس وقت درد سو رہا ہے تو میرے لئے بھی سونے کا موقع ہے۔ کسی بھی وقت درد جاگ جائے گا تو پھر سونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

چھوٹو نے منہ پھیرلیا۔ یہ شاید اس کا بے زاری کا اظہار تھا۔ مرزا صاحب اس کی بے نیازی پر جھنجلا گئے۔ "اب مختصر ترین بات سنو' مجھے سونے دو۔"

انہوں نے دوسری طرف کروٹ لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اپنی دکھتی ہوئی داڑھ کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں درد کبھی تھا ہی نہیں البتہ مسوڑھوں میں سوجن پہلے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ اب زبان پھیر کر اسے چیک کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ کون جانے زبان کا لمس اسے جگا دے۔ اس مہلت میں سو لینا ہی بہتر ہے۔

لیکن آنکھ لگی ہی تھی کہ کان میں پھر گدگدی ہوئی۔ اس بار وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ "تم یوں نہیں مانو گے۔۔۔ اب ایسا کیا تو میں تمہاری پٹائی کروں گا اچھی طرح۔" چھوٹو کو گھبراتا دیکھ کر ان کا دل دکھنے لگا۔ انہوں نے لہجہ نرم کر لیا۔ "دیکھو مجھے نیند کی ضرورت ہے۔ پوری رات جاگتا رہا ہوں۔ بہت تکلیف میں ہوں۔ کیا تم میرا خیال نہیں کرو گے؟"

چھوٹو نے باقاعدہ سرہلایا۔۔۔ اثبات میں۔۔ پھر وہ ان کے پہلو کی جانب سے ان کے سرہانے کی طرف منتقل ہو گیا۔

مرزا صاحب نے پھر آنکھیں بند کیں۔ انہیں نیند آ رہی تھی لیکن یہ خیال سونے نہیں دے رہا تھا کہ چھوٹو پھر شرارت کرے گا۔ چنانچہ چند لمحے بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ان کے سرہانے منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

انہیں اس پر پیار آگیا۔ "خفا ہو گئے دادا سے؟"

وہ ویسے ہی بیٹھا رہا۔ اس لمحے وہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

انہیں خیال آیا کہ کمرے کا دروازہ بند ہے۔ وہ اٹھے اور دروازہ کھولنے کیلئے بڑھے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ انہوں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "جاؤ۔۔۔ گھومو پھرو' سیر کرو۔"

دروازے کو پوری طرح کھول کر وہ پلٹے تو وہ پھر ان کے پیچھے چلا آیا۔ "تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟" انہوں نے لیٹتے ہوئے کہا۔

وہ پھر ان کے سرہانے جم کر بیٹھ گیا۔

"اور یونہی خفا بھی رہو گے؟"

"اس پر وہ ان کا ہاتھ سہلانے لگا۔"

"بس پھر بیٹھے رہو یہیں۔ لیکن اب مجھے ستانا مت۔" انہوں نے سخت لہجے میں کہا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے ہی لمحے وہ بے خبر سو رہے تھے۔

○

روبینہ نہا دھو کر ٹی وی لاؤنج میں آئی تو ثمینہ دسترخوان لگا رہی تھی۔ "باجی' بچوں نے تنگ تو نہیں کیا؟" اس نے ثمینہ سے پوچھا۔

"بچے کہاں تنگ کرتے ہیں روبی!" ثمینہ نے آہ بھر کے کہا۔

"ہاں ناشتے کے دوران میں کبھی آپس میں چل جاتی ہے۔ انڈوں پر جھگڑا ہو جاتا ہے کبھی۔"

"باجی' تم تو یہ بات ایسے اداس ہو کر کہہ رہی ہو جیسے تمہیں تنگ کئے جانے کا ارمان ہو۔" روبینہ نے کہا۔

"تمہیں یاد نہیں رہا کہ ہم اسکول کیسے جاتے تھے؟" ثمینہ نے ایک اور سرد آہ بھری۔

"یاد کیوں نہیں ہے؟" روبینہ نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔ "روز چھٹی کیلئے بہانہ

بناتے تھے۔ کبھی کھانسی، کبھی بخار، مگر بات کم ہی بنتی تھی۔ زبردستی اسکول بھیج دیا جاتا تھا اور کڑوی دوائیں الگ پینی پڑتی تھیں۔"

"کتنی بار ایسا ہوا کہ چوکیدار تمہیں ڈنڈا ڈولی کر کے اسکول لے کر گیا۔" ثمینہ بولی۔

"اور کتنی بار پاپا تمہیں گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔" روبینہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

ثمینہ ہنسنے لگی۔ اسے یہ حوالہ برا نہیں لگا تھا۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "مگر یہ ہمارے بچے اسکول جانے کیلئے یوں بے تاب ہوتے ہیں، جیسے پکنک پر جا رہے ہوں۔ ارمان ہی رہ گیا کہ کبھی چھٹی کی ضد کریں اور انہیں زبردستی اسکول بھیجوں۔"

"خوش نصیب ہیں، ان کے زمانے میں اسکول ایسے ہو گئے کہ چھٹی ہو جائے تو دل دکھتا ہے بچوں کا۔ اچھا تم ناشتہ تو کرو۔"

"اکیلے؟" روبینہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظر مرزا صاحب کے کمرے کے کھلے دروازے پر رک گئی۔

"ابو سو رہے ہیں۔" ثمینہ نے بتایا۔

"رات بھر داڑھ میں تکلیف رہی ہو گی۔" روبینہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ایک بجے تک تو میں بیٹھی رہی تھی ان کے پاس، پھر زبردستی بھیج دیا تھا مجھے سونے کے لئے۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ "اور امی؟"

"وہ بھی شاید دیر تک جاگی ہوں گی۔ آج دیر سے اٹھیں، تسبیح پڑھ رہی ہیں۔"

روبینہ ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ "اور چوزی؟" وہ چوزی سے بہت گھبراتی تھی۔ دسترخوان پر وہ بہت تیزی سے حملہ آور ہوتا تھا۔ کھانا دوبھر ہو جاتا تھا۔

"وہ ابو کے سرہانے بیٹھا پہرہ دے رہا ہے۔ تم بے فکری سے ناشتہ کرو۔" ثمینہ نے کہا۔

مگر روبینہ کو اطمینان نہیں ہوا۔ وہ گئی اور اس نے کمرے میں جھانکا۔ چوزی ابو کے سرہانے بیٹھا سو رہا تھا۔ اونگھتے اونگھتے اسے جھٹکا لگتا تو وہ آنکھیں کھول کر حیرت

سے ادھر ادھر دیکھتا اور اگلے ہی لمحے پھر آنکھیں موند لیتا۔

روبینہ کو اس پر مامتا آنے لگی۔ کہاں تو وہ دسترخوان پر اس کی موجودگی سے ڈرتی تھی۔ کہاں یہ جی چاہنے لگا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ "چوزی، چلو ناشتہ کر لو۔" اس نے پکارا۔ "بڑے مزے مزے کی چیزیں ہیں۔" اس نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

چوزی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور فوراً ہی بے نیازی سے سر گھما لیا۔ چند لمحے بعد وہ پھر اونگھنے لگا۔

روبینہ دسترخوان پر آ بیٹھی لیکن اس بار بھی اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ دسترخوان پر اکیلے ہونے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ جس روز اس کی دیر سے اٹھنے کی باری ہوتی، اس روز وہ ابو اور امی کے ساتھ ناشتہ کرتی۔ جلدی اٹھنے کی صورت میں آفتاب بھائی اور ظفر اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

"کیا ہوا؟ ناشتہ کرو نا۔" ثمینہ نے ٹوکا۔

"امی کا انتظار کروں گی۔ اکیلے اچھا نہیں لگتا۔"

"لو، میں آ گئی۔" کمرے کے دروازے سے نجمہ بیگم کی آواز آئی۔

ساس بہو نے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ پھر دسترخوان روبینہ نے سمیٹا۔ دونوں بہوئیں نجمہ بیگم کے پاس آ بیٹھیں۔ "امی آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے، مجھے کیا ہوا؟" نجمہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

"رات کو آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" روبینہ نے یاد دلایا۔

"وہ ـــ ارے وہ تو تمہارے ابو کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی۔ ہمیشہ ہو جاتی ہوں۔" نجمہ بیگم نے کہا پھر دونوں بہوؤں کو محبت سے دیکھا۔ "اللہ کا شکر ہے مجھے اتنی اچھی بہوئیں ملیں۔"

"شکر تو ہم ادا کرتے ہیں امی کہ ہمیں ایسا اچھا ماحول، ایسے اچھے لوگ ملے۔ جتنے اچھے ہم ماں باپ کے گھر میں تھے، اس سے بہتر یہاں ہیں۔" ثمینہ نے کہا۔

"اور یہ حقیقت ہے۔ منہ دیکھے کی بات نہیں۔" روبینہ بولی۔

نجمہ بیگم خوش ہو گئیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سچ تو یہ ہے بھئی کہ

گھر کا ماحول تو تم دونوں کا بنایا ہوا ہے۔ شاید تم دونوں سگی بہنیں نہ ہوتیں اور تم میں آپس میں اتنی محبت نہ ہوتی تو یہ اتنا اچھا ماحول نہ ہوتا۔ یہ تو تمہارا کمال ہے۔" ان کے لہجے میں سچائی اور خلوص تھا۔

"نہیں امی' مجھے یقین ہے کہ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا' تب بھی یہی ماحول ہوتا۔" ثمینہ نے کہا۔ "اصل میں آپ اور ابو ایسے محبت کرنے والے ہیں کہ بس اور ابو تو خود کہتے ہیں کہ وہ تو آدمی ہی محبت کے ہیں۔"

روبینہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "اور یہ سچ ہے--- خطرناک حد تک سچ۔"

نجمہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا تو اس کے چہرے کی تمتماہٹ اور بڑھ گئی۔

"خطرناک حد تک کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

روبینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ثمینہ ہنسنے لگی۔ "آپ کو نہیں پتہ؟" کچھ بتاؤ تو---" نجمہ بیگم کا تجسّس بھڑک اٹھا۔

"تم ہی بتاؤں روبی!" ثمینہ نے چھیڑنے والے لہجے میں بہن سے کہا۔

"وہ جب ابو ہمارے ہاں رشتہ مانگنے آئے تھے اور رشتے کی بات کئے بغیر چلے گئے تھے---" روبینہ کھو سی گئی۔

○

اس روز ثمینہ کہیں گئی ہوئی تھی۔ روبینہ' مرزا صاحب کے سامنے بیٹھی تھی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد مرزا صاحب نے پاپا سے کہا۔ "ثقلین صاحب' ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"کمال کرتے ہو مرزا۔ تمہاری بات کا برا کون مان سکتا ہے' کہو۔"

"میں بیٹی سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"لو-- اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ بھئی تمہاری ہی بیٹی ہے۔ چلو بیگم' تم کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" ثقلین صاحب نے رابعہ بیگم سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

روبینہ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ مرزا صاحب ان کے دور پرے کے رشتے دار تھے اور وہ انہیں دیکھتے ہی ان سے مرعوب ہو گئی تھی اور اب وہ اکیلے میں اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کیا بات کریں گے وہ اس سے؟ یہ سوچ کر اسے پسینے چھوٹنے لگے۔

مرزا صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے صوفے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ادھر آؤ-- یہاں-- میرے قریب آ کر بیٹھو۔"

وہ شرماتی' سمٹتی' جھجکتی ان کے پاس جا بیٹھی۔ "جی انکل؟"

"اس انکل' میں غیریت بہت ہے۔ ہم سے برداشت نہیں ہو گا لیکن خیر' فی الحال چلے گا۔" مرزا صاحب نے کہا پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ "بات یہ ہے بیٹی کہ ہمیں ایک ہی کام ڈھنگ سے کرنا آتا ہے-- محبت۔ دو بیٹیاں تھیں ہماری۔ وہ شادی کے بعد اپنے گھر کی ہو گئیں۔ رہ گئے دو بیٹے تو وہ اتنے مصروف ہیں کہ ہمیں ان سے

محبت کا موقع ہی نہیں ملتا اور بیٹیوں کے جانے کے بعد پتا چلا کہ بیٹوں سے ویسی محبت کی ہی نہیں جا سکتی۔ سو بیٹی، ہم تو بے کار ہو کر رہ گئے۔ بیٹیوں کی شادی کے بعد، اب فیصلہ کر لیا ہے کہ بیٹیاں کہیں سے لانی ہیں تاکہ ان سے محبت کر سکیں۔ وہ کام کر سکیں، جو ہم ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔ ہمارا گھر ممتا سے بھی بھرا ہوا ہے۔"

روبینہ سر جھکائے بیٹھی سنتی رہی۔ اس کی گھبراہٹ کم ہو گئی۔ مرزا صاحب کے لہجے میں ایسی حلاوت، ایسی محبت تھی جو تیزی سے اس کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ ان کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ ویسے اسے یقین تھا کہ وہاں بھی محبت ہی محبت ہو گی۔

"تمہیں بولنا نہیں آتا بیٹی؟ چڑیاں تو چہکتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں۔"

مرزا صاحب کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "موقع ہو تو بولوں انکل، بے محل بولنا تو اچھا نہیں ہوتا۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"ماشاء اللہ ذہین بھی ہو۔" مرزا صاحب کے لہجے میں ستائش تھی۔ "تم سوچ تو رہی ہو گی کہ میں اکیلے میں تم سے کیا بات کرنا چاہتا ہوں؟"

"جی ہاں۔"

"میں بتاتا ہوں۔۔ بات یہ ہے کہ پچھلی چھ پشتوں میں۔۔ یعنی مجھ تک، ہمارے خاندان میں محبت کی شادی ہوتی آئی ہے اور خدا کے فضل و کرم سے کامیاب رہی ہے۔ میرے لئے یہ خاندانی روایت بہت اہم ہے۔ دونوں فریقوں کی محبت کے بغیر میں شادی کا قائل نہیں۔"

ہر لفظ کے ساتھ روبینہ کا چہرہ تمتماتا جا رہا تھا لیکن مرزا صاحب اس سے بے خبر تھے۔

"مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔ اپنی امی اور پاپا کی موجودگی میں تم اس کا جواب نہیں دے سکتی تھیں اس لئے میں نے تنہائی میں تم سے بات کرنی چاہی۔"

روبینہ شرم سے دہری ہو گئی۔ حالانکہ ظفر نے اس مرحلے کے متعلق اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم میرے بیٹے آفتاب سے محبت کرتی ہو یا

نہیں۔"

○

نجمہ بیگم ہنستے ہنستے دہری ہو گئیں۔ "پھر۔۔؟" انہوں نے روبینہ سے پوچھا۔

"پھر کیا امی۔۔۔ میں تو سناٹے میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ آواز بھی نہیں نکلی میری۔"

نجمہ بیگم پھر ہنسنے لگیں۔ "پھر انہوں نے تمہیں ڈانٹا ہو گا۔"

"جی ہاں۔ کہنے لگے۔۔۔" روبینہ نے مرزا صاحب کی بھاری آواز اور لہجے کی نقل کی۔ "مجھے مختصر ترین مگر سچا۔۔ بالکل سچا جواب چاہئے۔ ہاں یا نہیں، مگر امی آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ابو نے مجھے ڈانٹا تھا۔"

"اصل میں میرے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔" نجمہ بیگم جھونک میں کہہ گئیں۔ فوراً ہی کھسیا کر انہوں نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

لیکن بہوئیں پیچھے پڑ گئیں۔ "بتائیں نا امی۔۔ کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ؟"

"اب چھوڑو نا اس بات کو۔"

"نہیں امی۔۔ آپ کو بتانا پڑے گا۔"

"بس اتنا ہوا تھا کہ تمہارے ابو نے مجھے زندگی میں پہلی اور آخری بار ڈانٹا تھا۔ اس دن کے بعد سے آج تک میں نے کبھی ڈانٹ نہیں سنی۔"

"تفصیل سے بتائیں نا۔"

نجمہ بیگم مسکرا دیں۔ کبھی بہت پرانی، بہت پرانی، بہت خوش گوار یادوں کو کسی کے ساتھ شیئر بھی کر لینا چاہئے۔

○

اس روز نجمہ بیگم گھر میں اکیلی تھیں۔ سب لوگ ایک شادی میں گئے ہوئے تھے۔ ان کا اگلے روز امتحان تھا۔ تیاری کے خیال سے وہ گھر پر رک گئی تھیں۔ وہ بیٹھی پڑھ رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دروازے پر گئیں۔ "کون ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"دروازہ کھولئے ــ ہم ہیں ــ ارباب بیگ!" باہر سے دھیمی آواز میں کہا گیا۔

نجمہ بیگم گھبرا گئیں۔ "گھر میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں ہے ارباب بھائی۔" انہوں نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے اسی لئے تو اس وقت آئے ہیں۔" جواب ملا۔

وہ اور گھبرا گئیں۔ "یہ تو مناسب نہیں آپ پھر کسی وقت آیئے گا۔"

"آپ دروازہ تو کھولئے مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ کوئی آ گیا تو ــــ"

"جواب دہی میں کر لوں گا۔ پلیز ــــ"

"ارباب بھائی، یہ ممکن نہیں۔"

"یہ زندگی اور موت کا سوال ہے خیر، آپ کوشش کیجئے گا کہ پچھتائیں نہیں، میں جاتا ہوں۔"

نجمہ بیگم پریشان ہو گئیں۔ ارباب ان کے سگے چچا زاد بھائی تھے۔ بہت شریف اور شائستہ نوجوان تھے۔ بات کرتے وقت نگاہیں نیچی رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ جانے کب چپکے سے ان کے دل میں آ بسے تھے۔ زندگی اور موت کا حوالہ سن کر وہ ڈر گئیں۔ انہوں نے دروازہ تو کھول دیا لیکن انہیں اندر آنے کا راستہ نہیں دیا۔

"اندر نہیں آنے دیں گی؟"

"یہ مناسب نہیں۔ آپ جلدی سے بات کر لیں۔"

"میں یہاں کھڑا ہو کر بات کروں اور آپ سنیں، یہ زیادہ نامناسب ہو گا۔"

بات معقول تھی۔ نجمہ بیگم ایک طرف ہٹ گئیں لیکن کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

کمرے میں بیٹھتے ہی مرزا ارباب نے ان سے پانی کی فرمائش کی۔ وہ پانی دے کر جانے لگیں تو وہ بولے۔ "کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"آپ کے لئے چائے بنانے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میری بات سن لیجئے تاکہ میں جلدی سے چلا جاؤں۔"

وہ بیٹھ گئیں۔ "جی فرمایئے؟"

اب مرزا ارباب گڑبڑائے۔ مگر فوراً ہی سخت لہجے میں بولے۔ "کیا آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں؟"

نجمہ بیگم ایسی گھبرائیں کہ ان کی آواز ہی بند ہو گئی۔

"وقت ضائع نہ کریں جواب دیں، ہاں یا نہیں۔" مرزا ارباب نے انہیں ڈانٹا۔

پہلے تو وہ سہمیں، پھر انہیں غصہ آ گیا۔ جی نہیں یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟" انہوں نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

مرزا فوراً ہی متاسف ہو گئے۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔" انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ چند لمحے کے توقف کے بعد بولے۔ "اچھا، کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اسی لمحے سے مجھ سے محبت شروع کر دیں؟"

نجمہ بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے محبت کوئی الیکٹرک ہے کہ سوئچ دبایا اور آن ہو گئی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"آپ مسئلہ تو بتائیں کہ کیا ہے؟"

مرزا چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔ "خاندانی روایت ہے کہ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو تو شادی ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ اب مجھے تو آپ سے محبت ہو چکی ہے لیکن آپ کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ کہتے کہتے رکے پھر پرامید لہجے میں بولے۔ "کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔ اچھا ہی ہوا، ابا آپ سے پوچھتے اور یہ جواب ملتا تو ہماری بڑی سبکی ہوتی۔"

نجمہ بیگم انہیں چھوڑنے دروازے تک گئیں۔ وہ بڑی کشمکش میں تھیں۔ حیا راستہ روک رہی تھی اور بات بنتے بنتے بگڑ رہی تھی۔ وہ تو مرزا ارباب کو پسند کرتی تھیں لیکن انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ وہ بھی انہیں پسند کرتے ہوں گے۔ اور خاندانی روایت بھی ان کے علم میں تھی۔

مرزا نے چوکھٹ پار کی تو ان سے رہا نہیں گیا۔ "سنئے ــ اب آپ کیا کریں

گے؟"

"کسی ایسی لڑکی کو تلاش کریں گے' جو ہم سے محبت کرتی ہو پھر خود اس سے محبت کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ نسبتاً آسان ہے۔" مرزا نے معصومیت سے جواب دیا۔

نجمہ بیگم کی کشمکش کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ موقع گنوانا تباہ کن ثابت ہوتا۔ "سنئے ارباب بھائی!"

مرزا ارباب نے پلٹ کر دیکھا۔ "جی؟" ان کے لہجے میں امید بھی تھی اور التجا بھی۔

میں اس لمحے سے آپ سے---" وہ کہتے کہتے اٹکیں۔ لفظ محبت زبان پر لانا ان کے لئے ناممکن تھا۔ انہوں نے جلدی سے بات بدل کر پوری کی۔ "آپ کو پسند کرنے لگی ہوں۔"

مرزا مایوس نظر آنے لگے۔ انہوں نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "ابا محبت سے کم پر نہیں مانیں گے۔"

"چچا مجھ سے پوچھیں گے تو میں انہیں قائل کر دوں گی۔" انہوں نے جلدی سے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ ان کا رخسار دروازے سے ٹکا ہوا تھا اور سینے میں دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

باہر سے مرزا کی طمانیت بھری آواز آئی۔ "شکریہ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔"

○

نجمہ بیگم کی روداد سننے کے بعد روبینہ نے کہا۔ مجھ پر نہ گزری ہوتی تو میں اسے افسانہ سمجھتی۔

نجمہ بیگم کو ادھوری بات کا خیال آگیا۔ "ہاں' تمہاری بات تو وہیں رہ گئی۔ یہ تو بتاؤ' انہوں نے ڈانٹا۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں پھر بھی چپ رہی' تب ابو نے دوبارہ ڈانٹا اور پھر......"

"سیدھی سی بات ہے۔ ہاں یا نہیں۔" مرزا صاحب نے کہا۔

نہیں انکل۔

مرزا صاحب کو شاک لگا۔ وہ چپ کے چپ رہ گئے۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں انکل......" روبینہ نے گھبرا کر کہا۔

"میں سمجھ گیا ہوں بیٹی۔ مرزا صاحب نے افسردہ لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ یہ آج کل کے لڑکے خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس آزادی اظہار کے دور میں یہ بات شرمناک ہے۔"

"یہ بات نہیں انکل۔ دراصل......"

"میں سمجھ گیا ہوں بیٹی۔ تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ اچھا' تم چائے بنا کر لاؤ میرے لیے۔ پاپا اور امی کو بھیج دینا......"

○

داڑھ میں اٹھنے والی ٹیسوں نے مرزا صاحب کو جگا دیا۔ ٹیسیں ذرا کم ہوئیں تو انہوں نے سرہانے کی طرف دیکھا۔ چھوٹو بدستور وہاں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ انہوں نے دم سادھ لیا کہ کہیں کان میں گدگدی کا سلسلہ پھر شروع نہ ہو جائے۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ باہر ٹی وی لاؤنج سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ نجمہ بیگم تھیں' دونوں بہوئیں تھیں۔ روبینہ کہہ رہی تھی۔ "ابو تو چلے آئے۔ امی میرے پیچھے پڑ گئیں۔ کہنے لگیں......یہ ارباب بھائی تو رشتہ مانگنے آئے تھے۔ بغیر بات کیے ہی چلے گئے' کیوں؟ میں خاموش رہی۔ کیا جواب دیتی۔ امی پورا دن مجھے کریدتی' الجھتی رہیں....."

روبینہ کی بات سن کر مرزا صاحب کو سب کچھ یاد آگیا۔ ایک بے ساختہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر مچلی۔ انہیں سب کچھ یاد آنے لگا۔

وہ ابھی اور سونا چاہتے تھے۔ احساس ہو رہا تھا کہ نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ درد پھر غائب ہو گیا تھا۔ وہ سو بھی سکتے تھے لیکن اب نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ دس سال پرانی یادوں سے کھیلنے لگے۔

○

دونوں بیٹوں نے کاروبار بہت اچھی طرح سنبھال لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مرزا صاحب آزاد ہو گئے تھے۔ جی چاہتا تو آفس جاتے اور جاتے تو جب جی چاہتا' اٹھ جاتے مگر دل اڑا اڑا رہتا تھا۔ دفتر کی مصروفیت کا متبادل کوئی تفریح نہیں تھی۔

اس رات بڑا بیٹا آفتاب ان کے پاس آ بیٹھا۔ انداز سے لگتا تھا کہ کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے لیکن ہچکچا رہا ہے۔ ”کوئی بات ہے آفتاب؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی نہیں ابو' ایسے ہی آپ کے پاس بیٹھنے کو دل چاہتا ہے۔“ آفتاب نے کہا۔

”اب دفتر میں تو آپ سے ملاقات کم ہی ہوتی ہے۔“

”بھئی اب تو سمجھ لو کہ میں ریٹائر ہو گیا۔ بہت کام کر لیا۔ تھک گیا' اب تم دونوں کی باری ہے۔“

مگر ہم آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔

مرزا صاحب نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں انہیں کوئی بات محسوس ہوئی تھی۔ ”کوئی خاص بات ہے بیٹے؟“

”نہیں ابو۔“

مرزا صاحب کو اس کے لہجے میں شکایت سی محسوس ہوئی تھی۔ شاید دفتر کی بے قاعدگی نے انہیں بیٹوں سے دور کر دیا تھا۔ ”میں دفتر آؤں یا نہ آؤں' تم لوگوں سے اتنا ہی قریب ہوں۔ یاد ہے ناں' میں باپ ہی نہیں' تمہارا سب سے اچھا دوست ہوں۔ تم مجھ سے ہر طرح کی بات کر سکتے ہو۔“

”جانتا ہوں ابو لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو خوش ہونا' خوش رہنا چاہئے۔ مجھے اکثر آپ چپ چپ اور بور نظر آتے ہیں۔“

مرزا صاحب بیٹے کے مشاہدے کے قائل ہو گئے۔ ”کام کی عادت ہو جاتی ہے ناں بیٹے! تو کام کے بغیر لطف نہیں آتا۔ ہاں اس سے بڑھ کر کوئی دلچسپی' کوئی تفریح مل جائے تو بات اور ہے۔“

”مثلاً؟“

”پوتے' پوتیاں ہوں تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔ دن چھوٹا پڑ جائے گا۔“

”تو میری اور ظفر کی شادی کر دیجئے۔“ آفتاب نے نظریں جھکا کر کہا۔

مرزا صاحب چونکے اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بیٹے کو غور سے دیکھا جو نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ارمان پورے ہونے کے دن آ رہے تھے۔ ان کا دل خوشی سے بھر گیا۔ تاہم انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اس سلسلے میں خاندانی روایت کا تو تمہیں علم ہے؟“

”جج.....جی.....جی ہاں ابو!“

”محبت کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔“

”بب....بالکل نہیں ہو سکتی۔“

”تو پھر؟“ انہوں نے بیٹے کو گھورا۔

”وہ...وہ مجھے ہو گئی ہے....اور ظفر کو بھی۔“

”ظفر کو بلاؤ۔“

چند لمحے بعد ظفر بھی ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”یہ آفتاب کہہ رہا ہے کہ تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے؟“ مرزا صاحب نے چھوٹے بیٹے سے پوچھا۔

”ہم دونوں کو ہو گئی ہے ابو!“ ظفر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

مرزا صاحب اچھل پڑے۔ ”ایک ہی لڑکی سے تو نہیں ہو گئی؟“

”نہیں ابو۔ وہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔“ آفتاب نے جلدی سے کہا۔

”گڈ نیوز۔ ویری گڈ۔ اب مجھے ان کا محل وقوع بتاؤ۔“

”جی....وہ.... ثقلین چچا....“

Scanned by iqbalmt

"ویری ویری گڈ۔ میں اور نجمہ پہلی فرصت میں ان کے گھر جائیں گے۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔" مرزا صاحب نے کہا مگر اسی لمحے فکرمند نظر آنے لگے۔ "تمہیں معلوم ہے ناں کہ دوسرے فریق کی محبت بھی ضروری ہے، اس کے بغیر بات نہیں بنے گی۔"

"جی.... ہم جانتے ہیں۔" دونوں بیٹوں نے بیک آواز کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ دونوں بھی تم سے محبت کرتی ہیں؟"

ظفر نے بے بسی سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ آفتاب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "جج.... جی.... بب.... بالکل۔"

"کیسے یقین ہے تمہیں؟" مرزا صاحب نے تیز لہجے میں پوچھا۔

آفتاب بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ میں نے کب کہا ابو؟

"ابھی کہا ناں.... جی بالکل...."

"وہ میں بالکل نہیں کہنے والا تھا کہ آپ نے بات اچک لی۔"

"تمہیں یقین ہی نہیں تو میں بات کیا کروں۔" مرزا صاحب نے اعتراض کیا۔

"وہ ابو، ہمیں گمان ہے کہ وہ بھی ہم سے وہ کرتی ہیں۔ آپ خود ان سے پوچھ لیجئے گا۔"

"خیر پوچھیں گے تو۔ لیکن تمہاری امی پوچھ لیں، یہی بہتر ہے۔"

لڑکے چلے گئے تو مرزا صاحب بہوؤں، پوتوں اور پوتیوں کے خواب دیکھنے لگے۔

یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں بھی سگی بہنیں تھیں۔ گھر کے ماحول کے لئے یہ بہت اچھا تھا۔ یہ بات وہ بیٹوں کو شروع ہی سے سمجھاتے آئے تھے کہ گھر عورتوں کے فساد کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں۔ ساس بہو کا جھگڑا علیحدگی لاتا ہے۔ ایسی لڑکی کا انتخاب کرو جو ساس سسر کو ماں باپ کا مرتبہ دے اور بیٹے دو ہوں تو دونوں بہوؤں کے درمیان ہم آہنگی بھی ضروری ہے ورنہ بھائیوں میں جدائی ہو سکتی ہے۔

شاید بیٹوں نے ان کی بات گرہ میں باندھ لی تھی۔

○

سونے سے پہلے انہوں نے یہ بات نجمہ بیگم کو بھی بتا دی۔ وہ بھی خوش ہو گئیں۔

طے یہ پایا کہ پہلے نجمہ بیگم، ثقلین بھائی کے گھر فون کریں گی، اشارہ دیں گی۔ پھر وہ اور مرزا صاحب ان کے گھر جائیں گے۔

سب کچھ ہو گیا لیکن جس روز انہیں ثقلین صاحب کے گھر جانا تھا، اس روز نجمہ بیگم کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہوں نے آفتاب سے کہہ دیا کہ دفتر سے ثقلین صاحب کے گھر فون کر کے بتا دے۔

مگر مرزا صاحب اتنے ایکسائیٹڈ تھے بہوؤں کو دیکھنے کے لئے کہ ان سے رہا نہیں گیا۔ ثقلین صاحب انہیں دیکھ کر حیران ہوئے۔ "پتہ چلا تھا کہ باجی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

"جی ہاں مگر میں چلا آیا۔ سوچا آپ انتظار کریں گے۔ یہ مناسب نہیں۔"

"اچھا کیا۔ آیئے.... تشریف لایئے۔"

مرزا صاحب ثقلین صاحب کے گھر سے واپس آئے تو مایوس اور دل گرفتہ بھی تھے اور مشتعل بھی۔ لڑکی انہیں پہلی نظر میں بھا گئی تھی مگر خاندانی روایت توڑی نہیں جا سکتی تھی۔ لڑکوں نے ناک کٹوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

گھر پہنچتے ہی انہوں نے دونوں بیٹوں کو اپنی عدالت میں طلب کر لیا۔ اب وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ اعتراف جرم ان کے چہروں پر صاف لکھا تھا۔

"ہاں تو تمہیں گمان تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہیں۔" مرزا صاحب کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔

"جج.... جی ابو۔"

"ابو کے بچے، اس اتنی اچھی، اتنی پیاری لڑکی نے صاف انکار کر دیا۔ صاف انکار لڑکی صرف اسی صورت میں کرتی ہے جب وہ کسی اور سے محبت کرتی ہو۔"

"یہی بات ہے ابو۔" آفتاب نے کہا۔

"تو پھر تمہیں جرات کیسے ہوئی؟"

"ابو، وہ روبینہ تھی۔ وہ ظفر سے.... میرے لئے ہاں کیسے کرتی؟"

مرزا صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"آپ کے جاتے ہی اس نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا کہ آپ اس سے بھائی کے

متعلق پوچھ رہے ہیں۔ وہ وضاحت بھی نہیں کر سکی۔"

"اور ثمینہ تو گھر میں تھی ہی نہیں۔ آپ کو اس سے میرے متعلق پوچھنا چاہئے تھا۔ آپ نے روبینہ سے پوچھ لیا۔" آفتاب بولا۔

"واقعی....دوسری تو تھی ہی نہیں مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ تمہاری والی گھر پر نہیں تھی؟"

"میں نے امی کی طبیعت کا بتانے کے لئے فون کیا تھا تو ثمینہ سے ہی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اب آپ لوگ نہیں آئیں گے' لہٰذا وہ اپنی سہیلی کی سالگرہ میں شریک ہو سکتی ہے۔"

مرزا صاحب کا ذہن اب بھی الجھ رہا تھا۔ "تمہارا مطلب ہے' میں نے غلط لڑکی سے صحیح لڑکے کے متعلق پوچھ لیا تھا؟"

"جی نہیں ابو۔ ظفر نے احتجاج کیا۔ آپ نے صحیح لڑکی سے غلط لڑکے کے بارے میں پوچھ لیا۔"

اس پر آفتاب نے ظفر کو گھور کر دیکھا۔ مرزا صاحب اپنے حساب کتاب میں مصروف تھے۔ "روبینہ' ثمینہ' آفتاب' ظفر...."

"جی نہیں ابو۔ ثمینہ' آفتاب۔ روبینہ' ظفریاب۔" آفتاب نے تصحیح کی۔

"تم گدھوں نے مجھے نام بھی نہیں بتائے تھے ان کے۔" مرزا صاحب بولے "اور یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ سب کچھ پہلے سے طے ہے۔"

بات سمجھنے کے بعد مرزا صاحب ہنسے اور اتنا ہنسے کہ برسوں میں نہیں ہنسے تھے۔ وہ بیٹوں کو بے وقوف سمجھ رہے تھے مگر بیٹے ان سے بہت تیز تھے۔

○

مسوڑھے سے اٹھنے والی ٹیسیں مرزا صاحب کو پھر حال میں کھینچ لائیں۔ وہ ٹیس بس ایک ثانیے کی تھی۔ اگلے ہی لمحے یوں معدوم ہو گئی جیسے تھی ہی نہیں۔ باہر سے آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ دونوں بہوئیں اب نجمہ بیگم سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں۔

مرزا صاحب نے دیواری گھڑی میں وقت دیکھا۔ دس بج چکے تھے۔ اتنی دیر تک وہ کبھی نہیں سوتے تھے۔ نہ ہی اتنی دیر تک سونا انہیں اچھا لگتا تھا مگر اس وقت ان سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ چکر آ رہے تھے۔

انہوں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ان پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ لمحوں میں وہ بے خبر سو گئے۔

○

امی کیا پکاؤں؟ گیارہ بج گئے۔ روبینہ نے نجمہ بیگم سے کہا۔

کچھ بھی پکا لو۔ نجمہ بیگم نے کہا لیکن فوراً ہی انہیں کچھ خیال آ گیا۔ "ایسا کرو' چائنیز رائس بنا لو۔ بچے کئی دن سے ضد کر رہے ہیں۔"

"ان کا بس چلے تو روز یہی کھائیں۔" روبینہ ہنسنے لگی۔

"بھئی اصل کھانا تو انہی کا ہے۔" نجمہ بیگم بھی ہنسنے لگیں۔

"چلیں.... ٹھیک ہے۔"

روبینہ کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ نجمہ بیگم بچوں کے کپڑے ٹھیک سے رکھنے میں لگ گئیں۔ مرزا صاحب ابھی تک سو رہے تھے۔ گھر میں سناٹا تھا جو بہت برا لگ رہا تھا۔ بچوں سے کیسی رونق ہوتی ہے۔ انہوں نے سوچا۔ پھر انہیں خیال آیا کہ رونق تو مرزا صاحب کے دم سے بھی ہے۔ اگر ابھی وہ جاگ رہے ہوتے تو دنیا جہان کی باتیں ہو رہی ہوتیں۔

وہ بہوؤں کے بارے میں سوچنے لگیں۔ دونوں کتنی اچھی ہیں۔ اللہ کی مہربانی ہے کہ انہیں اتنی اچھی بہوئیں ملیں ورنہ تو بہوؤں کے گھر میں آتے ہی ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے۔ کچھ تو یہ تھا کہ دونوں سگی بہنیں تھیں مگر اصل بات یہ تھی کہ طبعاً" دونوں اچھی تھیں۔ محبت اور لحاظ والی تھیں۔

دونوں ایک ساتھ اس گھر میں آئی تھیں۔ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں گھر میں ایسی مثالی یکجہتی اور محبت پیدا ہوئی تھی جو کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس میں اللہ کی پلاننگ کا کمال کلیدی کردار کا حامل تھا۔ ٹائمنگ کی

بڑی اہمیت تھی۔

شادی کے ایک سال بعد ثمینہ کے ہاں آفاق کی پیدائش ہوئی۔ خود نجمہ بیگم تو خیر تھیں ہی، مگر اس عرصے میں چھوٹی بہو روبینہ نے پورا گھر سنبھال لیا۔ یہی نہیں، زچگی کے بعد بھی وہ بچے کی دیکھ بھال تک کرتی تھی۔ پھر آفاق ایک سال کا ہوا تو روبینہ کی باری آئی۔ اشفاق پیدا ہوا تو ثمینہ نے چھوٹی بہن کا حق ادا کر دیا۔ اس کے دو سال بعد ثمینہ کے ہاں پھر بیٹا ہوا.... مشتاق۔ اور اس کے ایک سال بعد ثمینہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی آمنہ۔ اب ماشاء اللہ سب بڑے ہو گئے تھے۔ اسکول جاتے تھے۔ آمنہ پانچ سال کی تھی۔ مشتاق چھ سال کا۔ اشفاق آٹھ سال کا تھا اور آفاق نو سال کا۔ گھر خوشیوں اور رونقوں سے بھر گیا تھا۔

شاید وہ دونوں سگی بہنیں نہ ہوتیں تو گھر کا نظام ایسے منظم طریقے سے نہ چلتا۔ انہوں نے خود ہی آپس میں کام تقسیم کر لئے تھے اور اس شیڈول کو کوئی آسمانی ضابطے کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی ورنہ عام گھروں میں اس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کوئی جئے یا مرے، اپنی باری پر اپنے حصے کا کام تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہاں یہ ضابطہ فساد روکنے کے لئے نہیں، سب گھر والوں کی، ایک دوسرے کی سہولت کے لئے بنایا گیا تھا، لہٰذا ایک کی طبیعت خراب ہوتی تو دوسری بغیر کہے سنے ہنسی خوشی اس کے حصے کا کام آپ ہی کر لیتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گھر میں امن ہی امن تھا۔ کبھی کسی کو اونچی آواز میں بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

اب بچوں کے اسکول کو ہی لے لو۔ پونے سات بجے اسکول کی گاڑی آتی تھی۔ اس کے لئے جلدی اٹھنا ضروری تھا اور رات کو سوتے سوتے بارہ ایک تو بج ہی جاتے تھے۔ دونوں بہوؤں کے دو دو بچے ہیں۔ انہوں نے مل جل کر اچھا سسٹم بنا لیا۔ ایک صبح ایک بہو پانچ بجے اٹھتی تو دوسری صبح دوسری بہو جاگتی۔ جاگنے والی بچوں کو اٹھاتی، انہیں ناشتہ کراتی، تیار کر کے اسکول بھیجتی۔ آفتاب اور ظفر اٹھتے۔ ان کے ناشتے کا بندوبست کرتی۔ ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر ناشتہ کرتی۔ دوسری اٹھتی تو پہلی سو جاتی۔ دوسری ان کے اور مرزا صاحب کے ساتھ ناشتہ کرتی۔ اس روز دوپہر کا کھانا اس کے ذمے ہوتا اور رات کا کھانا پھر پہلی کی ذمے داری ہوتا۔ اگلے روز بھی یہی سب کچھ

ہوتا۔ بس بہو کا چہرہ اور نام بدل جاتا۔ چھٹی والے دن کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس روز تو بچے بھی معمول سے دیر تک سوتے تھے۔

اللہ بہت مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے اور ان کی خواہشیں پوری کرتا ہے۔ نجمہ بیگم کو خوب یاد تھا، یہ گھر، یہ گھرانہ اور یہ ماحول مرزا صاحب کا خواب تھا اور اس کے برعکس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتے تھے اور مرزا صاحب ایسے آدمی تھے جو وقت سے بہت پہلے ہر بات کی فکر کرتے تھے۔

شادی کے بعد نجمہ بیگم کو مرزا صاحب کی ایک عجیب عادت کا پتہ چلا۔ وہ پہلی بار انہیں شاپنگ کے لئے لے کر گئے تو انہوں نے ہر چیز انہیں دو کی تعداد میں خرید کرائی۔ دو سوٹ، دو جوڑی جوتے، دو ساڑھیاں۔ اس وقت تو نجمہ بیگم نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن بعد میں انہوں نے اسے خاص طور پر مارک کیا۔ وہ اپنے لئے چپل خریدنے جاتے۔ واپس آتے تو ان کے پاس دو جوڑی چپلیں ہوتیں۔ کپڑے بھی دو دو سے کم نہیں خریدتے تھے۔

”اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ ہر چیز دو عدد خریدتے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ میرا ذوق بہت اچھا ہے۔“ مرزا صاحب نے جواب دیا۔

”میں سمجھی نہیں....“

”ذوق بہت اچھا نہ ہوتا تو شاید ہر چیز درجنوں میں خریدتا۔“ مرزا صاحب نے وضاحت کی۔ ”کوئی چیز مشکل سے ہی پسند آتی ہے۔ مجھے اور پسند آجائے تو اسے چھوڑتا نہیں ہوں۔ اب آپ سوچیں کہ عامیانہ ذوق ہوتا تو کیا ہوتا؟“

نجمہ بیگم نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ ”مگر دو ہی کیوں؟“

”پتہ نہیں۔ ویسے بھی دو سے آگے تین اور کبھی چار تک بھی بڑھ جاتا ہوں۔ اب بازار میں ہر چیز کی ورائٹی تو بہت ہوتی ہے نا۔ کبھی دو سے زیادہ چیزیں بھی پسند آجاتی ہیں۔“

”مگر زیادہ تر دو ہی لیتے ہیں آپ ہر چیز۔“

”دو سے کم نہیں لیتا۔“

نجمہ بیگم کچھ پریشان ہو گئیں۔ انہیں یہ رجحان کچھ عجیب اور خطرناک لگا تھا۔

مرزا صاحب انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک مسکرائے اور شرارت بھرے لہجے میں بولے۔ ”پریشان نہ ہوں۔ آپ کی سوچ احمقانہ ہے۔“

نجمہ بیگم گڑبڑا گئیں۔ ”کیسی سوچ؟ کون سی سوچ؟“

”وہی جو آپ سوچ رہی ہیں۔“

”میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہی.....“

”یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز ایک ہو تو مجھے اچھی نہیں لگتی.....سوائے بیوی کے۔“ مرزا صاحب نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”بس شادی ہی وہ چیز ہے جو میں دوسری گوارا نہیں کر سکتا۔“

”سب ایسے ہی کہتے ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”ایسے ممکن ہے کہ میں دو عورتوں سے بیک وقت محبت نہیں کر سکتا اور محبت کے بغیر ہمارے خاندان میں شادی نہیں ہوتی۔“

”مگر یہ دو کا جادو.....“

”بھئی سوٹ خریدنے جاؤں اور دو سوٹ پسند آجائیں تو کیا کروں۔ اب میں اپنی پسند کی چیز چھوڑ تو نہیں سکتا۔“

بات آئی گئی ہو گئی مگر نجمہ بیگم اکثر اس پر سوچتیں اور پریشان ہو جاتیں۔ انہیں لگتا کہ کبھی نہ کبھی مرزا دوسری شادی ضرور کریں گے۔

پھر وہ ماں بنیں تو اور بھی حیران ہوئیں۔ ان کے ہاں جڑواں بیٹیاں ہوئی تھیں۔ مرزا اس پر خوب ہنسے۔ ”دیکھا.....اللہ میاں بھی مجھے میرے مزاج' میری فطرت کے مطابق ہی دیتے ہیں۔“

”یہی تو مجھے تو اور ڈر لگنے لگا ہے۔“

”بے وقوف ہیں آپ۔ بیویاں دو ملنی ہوتیں تو وہ بھی مجھے اکٹھا ہی ملتیں۔ ایک ایک کرکے لانے کا میں قائل نہیں۔“

پھر یوں ہوا کہ بیٹیوں کی پیدائش کے بعد مرزا دیر سے گھر آنے لگے۔ نجمہ بیگم کے دل میں وسوسے پلنے لگے۔ ویسے مرزا صاحب بیٹیوں سے پیار بہت کرتے تھے مگر نجمہ بیگم ان کی بے التفاتی سے ڈر گئی تھیں۔ حالانکہ ایسا بھی نہیں تھا۔ چھٹی کا دن وہ

ان کے ساتھ بڑے بھرپور انداز میں گزارتے تھے مگر عورت کا عدم تحفظ کا احساس بہت خطرناک ہوتا ہے۔

ایک دن انہوں نے مرزا صاحب سے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ بہت دیر سے گھر آرہے ہیں آج کل؟“

مرزا صاحب نے انہیں بہت غور سے دیکھا۔ پھر الٹا سوال کر ڈالا۔ ”آپ کے خیال میں اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟“

”اب میں کیا کہوں' میں کیا جانوں؟“

”یہ بات کہی ہے تو کچھ سوچا بھی ہوگا؟“ باریک بین مرزا بات سے بات پکڑنے کے قائل تھے۔

نجمہ بیگم نے بہت ٹالنا چاہا لیکن مرزا کسی کے پیچھے پڑ جاتے تو اسے چھوڑتے نہیں تھے۔ آخر نجمہ بیگم کو دل کی بات زبان پر لانا پڑی۔ ”یہی ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کا دل بھر گیا ہے مجھ سے۔“

”تم عورتوں کا دماغ بہت خراب ہوتا ہے۔ ارے تم کوئی مٹھائی ہو کہ دل بھر جائے گا تم سے۔“ مرزا کو غصہ آگیا۔

نجمہ بیگم روہانسی ہو گئیں۔ ”تو اور کیا سمجھوں آپ کی بے اعتنائی کو۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ مرزا صاحب نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”تم کیسی بیوی ہو کہ شوہر کی مصروفیت کا خیال نہیں آتا تمہیں۔ اس کی تھکن کا نہیں سوچتیں تم۔ اس کی پریشانیوں کی فکر نہیں کرتیں' الٹا اس سے شکایتیں کرتی ہو۔“

”پریشان! آپ پریشان ہیں؟“ نجمہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میں مستقبل کی طرف سے فکرمند ہوں۔“

”مگر کیوں؟“

”ارے بھئی ماشاء اللہ دو بیٹیاں ہیں ہماری۔ اس کا مطلب ہے دو شادیاں.... اور دو جہیز۔“

اب کے نجمہ بیگم نے سر پکڑ لیا۔ ”ابھی تو وہ بیچاریاں گھٹنوں چل رہی ہیں۔“

”چھ ماہ بعد چلیں گی ماشاء اللہ اور دیکھتے ہی دیکھتے دوڑنے لگیں گی اور دوڑتے

دوڑتے چپکے سے جوانی کی سرحد میں داخل ہو جائیں گی۔ آپ نہیں جانتیں، لڑکیوں کے بڑے ہونے کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ میں بے خبر نہیں رہ سکتا ان کی طرف سے۔"

"تو پھر؟"

"دن رات محنت کر کے کاروبار مستحکم کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ دو چار سال کی بات ہے۔ کاروبار جم جائے تو فرصت ہی فرصت ہوگی۔"

تو ایسے تھے مرزا ارباب بیگ۔ بہت پہلے سے فکر کرنے والے۔ اس روز سے نجمہ بیگم ان کا بہت خیال کرنے لگیں۔

دو سال بعد وہ پھر ماں بنیں ...... جڑواں بیٹوں کی۔ ان کی اپنی مصروفیت کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ جڑواں بچوں کے دو عدد سیٹ سنبھالنا مذاق نہیں ہوتا۔ وہ تو اماں کا دم غنیمت تھا ورنہ وہ پاگل ہی ہو جاتیں۔ اماں کے پاس ایک عمر کا تجربہ تھا.... دانش تھی۔ چھوٹی موٹی بیماریوں میں تو ڈاکٹر کے پاس جانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ گھریلو ٹوٹکوں ہی سے کام چل جاتا تھا اور اماں کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ پوتوں پر تو وہ جان چھڑکتی تھیں۔

مرزا صاحب کی مصروفیت چھ سال پر پھیل گئی مگر اس عرصے میں انہوں نے کاروبار کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ کہاں وہ اکیلے کام کرتے تھے اور کہاں اب ان کے درجنوں کارندے تھے۔ آدمی کی انہیں پہچان بہت تھی۔ قدرشناس بھی تھے، لہٰذا ان کے لئے کام کرنے والے ایماندار اور محنتی بھی تھے اور وفادار بھی۔ مصروفیت کے چھ برسوں کے بعد انہیں فرصت ملی۔ اس وقت تک بیٹے چار سال کے اور بیٹیاں چھ سال کی ہو چکی تھیں اور وہ دونوں بیٹیوں کے لئے سونے کے دو دو سیٹ بنوا چکے تھے۔ اپنی طرف سے انہوں نے ان کے جہیز کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

اب مرزا صاحب کے پاس بچوں کو دینے کے لئے وقت بہت تھا۔ وہ بچوں سے محبت بہت کرتے تھے لیکن تربیت کے معاملے میں وہ سخت بھی بہت تھے۔ اس معاملے میں ان کی اماں سے نہیں بنتی تھی۔ انہیں اماں سے شکایت تھی کہ وہ بچوں کو لاڈ پیار میں بگاڑ رہی ہیں۔ اماں ہربار انہیں بری طرح ڈپٹ دیتیں۔

"بدتمیزی تو برداشت نہیں کی جاسکتی اماں۔"

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟" اماں کہتیں۔ "تو جس طرح انہیں سمجھاتا ہے، ابھی ان کی عمر ہے سمجھنے کی۔"

"اس طرح تو خراب ہو جائیں گے یہ۔ بری عادتیں پختہ ہو جائیں گی۔"

"نہیں ہوں گی۔ وقت پر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"خود بہ خود؟"

"ہاں، خود بہ خود۔"

اماں سے تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ بیٹوں پر سختی کرتے تو وہ جا کر دادی سے لپٹ جاتے۔ مرزا بس نجمہ بیگم کے سامنے دل کی بھڑاس نکال سکتے تھے۔ "بچوں کو تباہ کر رہی ہیں اماں۔ اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"خوامخواہ پریشان ہوتے ہیں آپ۔" نجمہ بیگم کہتیں۔ "بچوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کے بچے ہیں، اچھے ہی اٹھیں گے۔"

"خاک اچھے اٹھیں گے۔ مرزا جل کر کہتے۔ میں انہیں ڈانٹتا ہوں تو اماں مجھے ڈانٹ دیتی ہیں۔ ان کی نظروں میں میری کیا وقعت رہے گی۔"

"وہ اماں ہیں آپ کی۔ آپ اس عمر میں ان کی ڈانٹ سن کر چپ رہتے ہیں تو بچے اس سے بھی بہت کچھ سیکھیں گے۔"

"جانتی ہو، جس بات پر اماں نے مجھے مار مار کر پلپلا کر دیا تھا، اس سے کہیں بڑی بات پر ان بچوں کو چومنے چاٹنے لگتی ہیں اماں۔"

"آدمی اپنی تمام سختی اولاد پر ختم کر دیتا ہے۔ پوتے، پوتیوں کے لئے نرمی کے سوا کچھ نہیں بچتا اس کے پاس۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات۔"

"دادا بنیں گے تو سمجھیں گے۔"

"مگر اس وقت تک میرے اپنے بیٹے بگڑ چکے ہوں گے۔" مرزا صاحب نے جھنجلا کر کہا۔

نجمہ بیگم دل ہی دل میں خدا نہ کرے کہہ کر رہ گئیں۔

پھر اچانک.....بالکل اچانک مرزا صاحب میں ایک تبدیلی آئی۔ کہاں تو وہ جمعے کی

نماز بھی نہیں پڑھتے تھے۔ کہاں ایک دم پنج وقتہ نمازی ہوگئے۔ ایک کمرے کی ہیئت ہی تبدیل کر دی گئی۔ وہاں سے ہر تصویر ہٹا دی گئی اور وہ عبادت کا کمرہ قرار پایا۔

اس اچانک تبدیلی نے نجمہ بیگم کے تجسّس کو بھڑکا دیا۔ "یہ اچانک آپ کو کیا ہوا؟" انہوں نے مرزا صاحب سے پوچھا۔

"بڑھاپے میں آخرت کی فکر تو ہوتی ہی ہے۔" مرزا نے بے پروائی سے کہا۔

"خیر.... یہ بات تو نہیں ہے۔ ابھی تو آپ چالیس کے بھی نہیں ہوئے۔"

"بچوں کے لئے سب کچھ کرتا ہے آدمی۔" مرزا بولے۔ "بچے مجھے نماز پڑھتے دیکھیں گے تو ان کا رجحان بھی بنے گا۔ پھر اب ذرا زندگی کی بھاگ دوڑ سے فراغت بھی ملی ہے تو اس کوتاہی کا خیال آیا ہے۔"

"مگر کوئی اور بات بھی ہے؟"

"ہاں۔ اللہ ہی سپریم اتھارٹی ہے۔ اماں کے خلاف کیس لے کر میں اور کہاں جا سکتا ہوں۔" مرزا جیسے پھٹ پڑے۔

"اماں کے خلاف کیس!" نجمہ بیگم گھبرا گئیں۔

"ارے۔ کوئی بددعا تھوڑا ہی کرتا ہوں۔" مرزا نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر؟"

"بھئی اماں بچوں کو بگاڑ رہی ہیں۔ میں انہیں روک بھی نہیں سکتا۔" مرزا کے لہجے میں شکایت در آئی۔ "سو میں اللہ سے گڑگڑا کر بچوں کے لئے نیکی اور سعادت، عافیت اور فلاح مانگتا ہوں۔ اس کے سوا کچھ بھی تو نہیں کر سکتا میں۔"

نجمہ بیگم کو ہنسی آگئی۔ "کمال کرتے ہیں آپ بھی۔"

"جی نہیں۔ بروقت بات سمجھ میں آئی ہے۔ ابھی سے بچوں کے لئے مسلسل دعا کروں گا تو انشاء اللہ وہ میرا نام روشن کریں گے۔ قابل فخر بنیں گے۔" مرزا کے لہجے میں بے حد تقدس آمیز سنجیدگی تھی۔

نجمہ بیگم سوچتی رہیں۔ باپ بننے کے بعد آدمی کیسا بدل جاتا ہے۔ بچوں کی خاطر اپنی سمت درست کرتا ہے۔ اپنے اعمال سدھارتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنی کوئی خرابی، کوئی برائی اپنے بچوں میں نہیں دیکھنا چاہتا۔

پھر مرزا کا نماز پڑھنا ایک ایسا معمول بن گیا جس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ہاں، کبھی نماز قضا ہوتی تو ضرور عجیب سا لگتا مگر ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔

کوئی تین چار سال بعد ایک روز مرزا گھر آئے تو چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

نجمہ بیگم نے ان سے سبب پوچھا۔ پہلے تو وہ ٹالتے رہے، پھر اچانک پھٹ پڑے۔ "کیا بتاؤں بیگم۔ غضب ہو گیا۔"

نجمہ بیگم بھی پریشان ہو گئیں۔ دل میں ہول اٹھنے لگے۔ خدا جانے.... کوئی بہت بڑی بات ہوگی ورنہ مرزا اتنی آسانی سے پریشان ہونے والے نہیں۔ "کچھ بتایئے بھی، ہوا کیا ہے؟" وہ جھنجلا کر بولیں۔

"بس کچھ نہ پوچھو۔ دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔" مرزا دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

"ہولائے جائیں گے، بتائیں گے کچھ نہیں۔" نجمہ بیگم کو غصہ آگیا۔

"ارے.... وہ چھبن باجی کا بڑا بیٹا ہے نا...."

نجمہ بیگم نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ "اصغر.... کیا ہوا اصغر کو۔" وہ بوکھلا گئیں۔ ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے تھے اصغر کی شادی کو۔ چھ ماہ کا ایک بیٹا تھا اس کا۔

"اصغر کو کیا ہونا تھا۔" مرزا نے تاسف سے کہا۔ جیسے اصغر کو کچھ ہو جانا بہتر ہوتا۔ "پچھلے ایک مہینے سے گھر میں لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ چھبن باجی کی بہو نے فساد ڈال رکھا تھا۔ بات بات پر لڑائی، سکون نہیں رہا تھا گھر میں۔"

"تو ہوا کیا؟ چھبن باجی.... انور بھائی تو خیریت سے ہیں؟"

"وہ سب تو خیریت سے ہیں، البتہ گھر کی خیریت نہیں ہے۔" مرزا نے ایک دل دوز آہ بھری۔

"کیا مصیبت ہے۔ آپ بتاتے کیوں نہیں۔" نجمہ بیگم نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "ہوا کیا ہے آخر؟"

"وہی جو ایسے میں ہوتا ہے۔ اصغر نے گھر چھوڑ دیا۔ الگ مکان لے لیا۔ آج شفٹ بھی ہو گیا۔"

نجمہ بیگم نے انہیں یوں دیکھا جیسے ان کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ "تو اس

میں کون سی خاص بات ہے؟" انہوں نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

اس پر مرزا نے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ "یہ کوئی بات ہی نہیں!"

"ہرگز نہیں۔ آج کل 95 فیصد یہی ہوتا ہے۔ بہوئیں بڑے چاؤ سے لائی جاتی ہیں اور جلد یا بدیر الگ ہو جاتی ہیں۔ جو عقلمند ہوتی ہیں' وہ خوش اسلوبی سے یہ کام کرتی ہیں لیکن زیادہ تر یہ لحاظ بھی نہیں کرتیں تاکہ تعلقات میں سردمہری آجائے اور بعد کے مسائل سے بچی رہیں۔" نجمہ بیگم نے گہری سانس لی۔ "اصغر کی دلہن تو اچھی تھی جو دو سال برداشت کر گئی ورنہ تو دو تین مہینے میں ہی کام ہو جاتا ہے۔"

مرزا انہیں بے یقینی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ "کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟"

"آپ کو پتہ ہی نہیں۔ کہیں آتے جاتے ہی کہاں ہیں آپ۔"

"مگر یہ تو المیہ ہے۔ چھبن باجی بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ اصغر اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" نجمہ بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ "جن کے سات بیٹے ہوں اور ساتوں کو ان کی بیویاں اڑا کر لے جائیں' ان کی اذیت زیادہ ہو گی میرے خیال میں' مگر سب جھیل جاتے ہیں۔ زندگی ہے۔ موت تک تو ہر حال میں گزارنی ہوتی ہے۔"

"مرزا کا جسم لرزنے لگا۔ چہرہ سپید پڑ گیا۔"

"آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ طبیعت خراب کر لیں گے اپنی"۔

"وہ تو ہو گئی۔ میں نے چھبن باجی کو روتے دیکھا۔ پھر ان کے دکھ کا تصور کیا تو دل پھٹنے لگا میرا۔ میں نے سوچا' مجھ پر خدانخواستہ یہ گزری تو میرا کیا بنے گا۔ ذرا سوچو۔ بیٹیاں تو اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔ بہوئیں بیٹوں کو لے کر نکل لیں تو ہم تم اکیلے رہ جائیں گے بڑھاپے میں۔"

"تو کیا ہوا۔ بس اللہ محتاج نہ کرے کسی کا۔ اپنی آمدنی ہو۔ چلتے ہاتھ پیر ہوں بس۔" نجمہ بیگم نے بے پروائی سے کہا۔ حالانکہ اندر ہی اندر وہ اداس ہو گئی تھیں۔

"نہیں بھئی۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ دکھ مجھے ملا تو ختم کر دے گا۔" مرزا

نے یوں گھبرا کر کہا' جیسے ان کا دم گھٹا جا رہا ہو۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ دکھ برداشت کرنے کی صلاحیت بھی دیتا ہے۔"

مرزا صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "لو....وہ دکھ سے بچا بھی تو سکتا ہے۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بچے ابھی پرائمری میں ہیں اور آپ بہوؤں کے الگ ہو جانے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں....سوت نہ کپاس' جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ ابھی سے پریشان ہونے کا فائدہ؟"

مرزا نے انہیں یوں دیکھا جیسے انہیں بے وقوف سمجھ رہے ہوں۔ "اصل بات یہ ہے کہ کس چیز کی کیا اہمیت ہے؟ بہت اہم چیزوں کے لئے تو پہلے سے فکر کرنی پڑتی ہے۔"

"تو آپ کیا کریں گے؟"

"کچھ نہ کچھ تو کروں گا۔"

اس دن کے بعد مرزا کی عشا کی نماز طویل......بہت طویل ہونے لگی۔ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی مگر نجمہ بیگم کو تجسس تھا۔ ایک دن پتہ چل ہی گیا۔ اس دن وہ کسی کام سے نماز کے کمرے میں گئیں تو پتہ چلا کہ مرزا سجدے میں گرے زار و قطار رو رہے ہیں۔ ہچکیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ دعا کر رہے تھے لیکن لفظ ٹوٹے جا رہے تھے۔ بہت غور کرنے پر لفظ سمجھ میں آئے..... "اللہ العالمین میرے گھر کو بکھرنے نہ دینا۔ میرے بیٹوں کو سعادت مند بنانا۔ انہیں ایک دوسرے کی' ماں باپ کی' محبت دینا۔ اے پروردگار' مجھے ایسی بہوئیں عطا فرمانا جو آپس میں محبت رکھتی ہوں۔ جو جڑ کر رہیں اور جوڑ کر رکھیں....."

نجمہ بیگم بہت خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئیں۔ انہیں اس وقت مرزا پر بہت پیار آیا۔ وہ اپنے گھر سے.....گھر کے لوگوں سے کتنی محبت کرتے تھے۔

اور نجمہ بیگم جانتی تھیں کہ عشا کے بعد خشوع و خضوع سے یہ دعا کرنے کا مرزا کا معمول اب بھی جاری ہے۔

مرزا میں ایک اور تبدیلی بھی آئی۔ اگرچہ بیٹے ابھی بہت چھوٹے تھے مگر وہ ان کے دوست بن گئے۔ سختی بالکل چھوڑ دی بلکہ وہ ان کے ساتھ باقاعدگی سے کھیلنے لگے۔

Scanned by iqbalmt

ساتھ ہی وہ ان سے ہر طرح کی بات کرتے۔ وہ ان کی تربیت کر رہے تھے کہ دنیا میں باپ سے اچھا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ وہ انہیں باور کرا رہے تھے کہ باپ سے ہر موضوع، ہر مسئلے پر بات کی جا سکتی ہے۔

ایک دن نجمہ بیگم نے انہیں ٹوک دیا۔ ”بچوں سے اتنی قربت بھی اچھی نہیں۔“

”وہ کیسے؟“ مرزا نے انہیں گھورا۔

”بچوں سے قبل از وقت بات نہیں کرنی چاہئے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اس کی اہمیت سمجھ ہی نہ سکیں تو کیا حاصل؟“

”یہ آپ اماں والی بات کر رہی ہیں۔ میرا نظریہ مختلف ہے۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے، جس پر بچہ دھیان نہ دے، وہ کان میں پڑتی ہے تو لاشعور میں جا گھستی ہے۔ وہ محو کبھی نہیں ہوتی، بہت طاقتور تلقین بن جاتی ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتیں آپ کی باتیں۔“

”ضرورت بھی کیا ہے سمجھنے کی۔ آپ اپنی کرتی رہئے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔“

○

لڑکوں نے میٹرک کیا۔ کالج میں چلے گئے۔ نجمہ بیگم نے دیکھا کہ اب مرزا ان سے خاندان کے موضوع پر بات کرتے تھے۔ گھر کیا ہے، کیسا ہونا چاہئے۔ پرسکون گھر کے فائدے کیا ہیں۔ محبت کتنی بڑی چیز ہے۔ پھر شادی پر بات ہونے لگی۔ مل کر رہنے کے فائدے اور نقصان۔ ایثار اور قربانی۔ وہ لڑکوں میں یہ سب کچھ ٹھونس رہے تھے۔

اس روز نجمہ بیگم حیران رہ گئیں۔ آفتاب، مرزا صاحب سے کہہ رہا تھا۔

”ابو....ہمارا گھر ایسا ہی رہے گا۔ ہم کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوں گے۔“

”یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟“ مرزا نے اسے چیلنج کیا۔

”میں ظفر سے محبت کرتا ہوں۔ اس کی خوشی کے لئے اپنے کسی بھی حق سے دستبردار ہو سکتا ہوں۔“

”اور ایسی نوبت آئے گی ہی نہیں۔“ ظفر نے جلدی سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ میں بھائی سے پچاس منٹ چھوٹا ہوں۔ ان کا احترام میرا فرض ہے۔“

”اس سے کچھ نہیں ہوتا۔“ مرزا بولے۔ ”گھر کا بننا بگڑنا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“

دونوں لڑکوں نے مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”مایوسی کی کوئی بات نہیں۔“ مرزا نے جلدی سے کہا۔ ”بیوی کا انتخاب بہت اہم چیز ہے۔ اگر لڑکی نے اپنے گھر میں اتفاق اور محبت دیکھی ہوگی، اگر اسے ماں باپ اور بھائیوں سے محبت اور ان کی عزت کرنا آتا ہوگا تو وہ سسرال میں بھی جڑ کر رہے گی۔ پھر ایک اور بات ہے۔ بیوی شوہر سے سب کچھ سیکھتی ہے۔ اس کی پسند ناپسند سے سمجھوتہ کرتی ہے۔ عقل مند شوہر ابتداء ہی میں بیوی کو سمجھا دیتے ہیں کہ کون سی چیزیں اٹل ہیں۔ کن باتوں پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہو جائے تو گھر میں امن رہتا ہے۔“

دونوں لڑکے مسکرائے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”لیکن اس کے باوجود بھی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔“ مرزا نے کہا۔ لڑکے پھر گھبرائے۔ مرزا نے وضاحت کی۔ ”اب فرض کر لو، تم دونوں کی شادی ہوتی ہے اور دونوں کو بہت اچھی بیویاں ملتی ہیں۔ تب بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ اگر ان دونوں میں باہمی محبت نہیں ہوگی تو چھوٹی چھوٹی شکایتیں پیدا ہوں گی۔ پھر وہ بڑی ہوں گی۔ افہام و تفہیم اور درگزر کی کمی ہوگی۔ ایک شکایت کرے گی کہ دوسری کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے بچوں پر جھگڑا ہوگا۔ یوں انتشار پیدا ہوگا۔“

”بھئی....میں تو شادی کروں گا ہی نہیں۔“ ظفر نے مایوسی سے کہا۔

”میں بھی....“ آفتاب بولا۔

”ایسی بات نہیں۔ اس مسئلے کا حل بھی ہے۔“ مرزا صاحب بولے۔ ”اگر تمہاری بیویوں کو ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت ہو، جتنی تمہیں ہے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں....“

مرزا کہتے رہے۔ نجمہ بیگم کئی بار مداخلت کرتے کرتے رہ گئیں لیکن آخر وہ

مسکرائیں۔ ان کے شوہر' بیٹوں کو مثبت باتیں سکھا رہے تھے اور منفی باتوں کی نفی کر رہے تھے مگر ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو مشیت ہے۔ وہ خود بھی بہت دعا کرتی تھیں۔ جانتی تھیں کہ خدانخواستہ ایسا کچھ ہوا تو مرزا کے لئے وہ بہت بڑا صدمہ ہوگا۔

اور اب ان کے گھر میں دو بہوئیں تھیں جو پہلے محبت کرنے والی سگی بہنیں تھیں اور دیورانی جٹھانی بعد میں۔ یہ مرزا کی برسوں کی دعاؤں کا ثمر تھا یا بچوں کو سونپی جانے والی تلقین کا نتیجہ۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن سچ یہ تھا کہ ان کا گھر مثالی گھر بن گیا تھا۔ اس کے لئے وہ جتنا بھی شکر ادا کرتیں' کم تھا۔ مرزا اب بھی عشا کی لمبی نمازیں پڑھتے تھے۔ شاید اب پوتوں کے لئے دعا کرتے ہوں گے اور شکر بھی ادا کرتے ہوں گے۔

اب کاروبار بیٹوں نے سنبھال لیا تھا۔ مرزا صاحب کا اپنا خاصا صحت مند بینک اکاؤنٹ تھا مگر بیٹے اس کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے تھے۔ مرزا کے پاس فرصت ہی فرصت تھی لیکن وقت پھر بھی کم پڑتا تھا۔ پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیلنا' باتیں کرنا۔ پھر انہیں قرآن پاک کا بھی شوق ہو گیا تھا۔ ترجمے سے پڑھتے' سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اکثر ان پر گریہ طاری ہو جاتا...

○

"امی.....یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟ اتنی گرمی ہے۔"

نجمہ بیگم نے چونک کر دیکھا۔ وہ ثمینہ تھی۔ "ارے.....تم سوئی نہیں؟ یہ ثمینہ کے سونے کا وقت تھا کیونکہ وہ صبح سویرے کی اٹھی ہوئی تھی۔"

"آنکھ لگی ہی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔" ثمینہ نے کہا۔

نجمہ بیگم کو پہلی بار احساس ہوا کہ لائٹ چلی گئی ہے۔ "چلو.....ٹی وی لاؤنج میں چل کر بیٹھیں۔"

وہ بہو کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں چلی آئیں۔ ثمینہ نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور لوہے کا گیٹ بند کر دیا۔ لوہے کے گیٹ میں جالی لگی تھی۔ کمرا ہوا اور روشنی سے بھر

گیا۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ گئیں۔ روبینہ کچن میں کام کر رہی تھی۔

"کیسا اچھا فلیٹ ہے ماشاء اللہ۔ لائٹ چلی جائے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔" ثمینہ نے پرستائش لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اللہ کا شکر ہے۔" نجمہ بیگم بولیں۔

"فلیٹ عام طور پر ایسے نہیں ہوتے۔" روبینہ نے کچن میں کام کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مکان لگتا ہے' مکان۔"

"سچ کہہ رہی ہو' فلیٹ ایسے نہیں ہوتے۔ ان میں گھٹن ہوتی ہے۔" نجمہ بیگم نے کہا۔

"یہ ملا کیسے آپ لوگوں کو؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"ملا کہاں۔ ڈیڑھ ماہ تمہارے ابو ڈھونڈتے پھرے۔ پھر یہ فلیٹ نظر آیا اور انہوں نے سوچ لیا کہ اسے خرید کر ہی رہیں گے۔" نجمہ بیگم کہتے کہتے رکیں۔ "ورنہ یہ تو فلیٹ میں رہنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ کہتے تھے' نہ زمین اپنی' نہ چھت اپنی۔ ایسا کوئی گھر ہوتا ہے۔"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن یہاں تو چھت بھی ہے۔" روبینہ کچن سے نکل آئی۔

"چھت! چھت تو یہاں نہیں ہے۔" نجمہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

ثمینہ ہنسنے لگی۔ "امی' جب جی چاہتا ہے' ہم لوگ زینے پر جا بیٹھتے ہیں۔ یقین کریں' ایسا ہی لگتا ہے کہ چھت پر بیٹھے ہیں۔"

اور یہ سچ تھا۔ یہ تیسری منزل کا فلیٹ تھا اوپر جو فیملی رہتی تھی' وہ مختصر بھی تھی اور ان سے انڈراسٹینڈنگ بھی تھی۔ بہت اچھے لوگ تھے' لہٰذا وہ زینے پر آزادی سے جا بیٹھتیں۔ کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ زینے پر دو کے بجائے ایک فلیٹ ہو تو یہ سہولت رہتی ہے کہ وہ گزرگاہ نہیں بنتا اور پھر وہ کھلا زینہ تھا۔ آسمان کے نیچے بیٹھنے کا مزا آتا تھا.....وہی چھت جیسا!

"تو ابو فلیٹ کے قائل نہیں تھے؟" روبینہ نے پوچھا۔

"قائل.....ارے سخت ناپسند کرتے تھے فلیٹ کی زندگی کو۔"

"مگر آپ کا تو بہت بڑا گھر تھا۔" ثمینہ نے کہا۔

"ہاں.....چھ سو گز پر تھا۔"

"ابو فلیٹ میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور اپنا بہت بڑا گھر تھا تو پھر یہ نوبت کیسے آئی؟" روبینہ نے اعتراض کیا۔

"بس بیٹا اللہ کی مرضی۔ یہ گھر نصیب میں تھا' سو یہاں آ گئے اور اللہ کا شکر ہے۔ یہاں پہلے سے زیادہ خوش ہیں۔"

"مگر کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"ہاں' وہاں ہمارے پڑوس میں ڈاکہ پڑا تھا۔ بس اس کے بعد تمہارے ابو نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہاں نہیں رہنا۔ کوئی فلیٹ لیں گے۔" نجمہ بیگم خیالوں میں کھو گئیں۔ وہ بہوؤں کو تفصیل بتانے لگیں.....

○

اٹھارہ سال پرانی بات تھی!

باسط صاحب کے گھر میں اس روز پاس پڑوس کے سب لوگ جمع تھے۔ باسط صاحب ڈاکے کی لرزہ خیز تفصیلات بتا رہے تھے۔ سب لوگ متوحش بیٹھے سانسیں روکے سن رہے تھے۔ دوسری طرف خواتین کو بیگم باسط یہی سب کچھ بتا رہی تھیں۔

باسط صاحب کے بیان کے مطابق ڈاکو رات پونے بارہ بجے ان کے بنگلے میں گھسے تھے۔ وہ پانچ تھے اور انہوں نے چہروں کے نچلے حصے پر رومال باندھ رکھے تھے۔ وہ سب جوان تھے۔ سب مسلح بھی تھے۔

"انہوں نے آتے ہی اعلان کیا کہ وہ فجر تک یہاں رہیں گے۔" باسط صاحب نے بتایا۔

"فجر تک؟ کمال ہے بھئی' ڈاکو بھی نماز پڑھنے لگے۔" مصباح صاحب نے حیرت سے کہا۔

"نماز کیسی بھائی' تمسخر کر رہے تھے بدبخت۔ بعد میں وضاحت کی۔ کہہ رہے تھے کہ فجر کے بعد گشتی پولیس والے بھی گھر جا کر سو جاتے ہیں۔ واردات کر کے سکون سے نکل لینے کے لئے یہ مناسب ترین وقت ہوتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے تھے۔" وارثی صاحب نے سر ہلایا۔ "تو وہ رات بھر یہاں رہے؟"

"جی ہاں۔ سوا چھ بجے جان چھوڑی کمینوں نے۔"

"اتنا وقت کیسے گزارا ہوگا؟" مصباح صاحب نے کہا۔

"ان کی کیا کہتے ہیں۔ یہ پوچھیں کہ ہم پر کیا گزری اس دوران میں۔" باسط

صاحب نے دکھی لہجے میں کہا۔ "وہ تو پہلے کچن میں گھسے۔ کھانا پکانے کا حکم دیا۔ میری بیوی بچیوں کو لے کر کچن میں چلی گئی اور انہوں نے وی سی آر پر فلم لگالی مزے سے۔ کھانا کھا کر انہوں نے فریج سے میٹھا نکال کر کھایا۔ کمبخت ایسے مزے سے بیٹھے تھے' جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ ہم ساری رات سولی پر ٹنگے رہے۔" باسط صاحب رونے لگے۔ ساڑھے تین بجے انہوں نے مال سمیٹنے کی کارروائی شروع کی۔

"کتنا نقصان ہوا آپ کا؟"

"ارے تنکا بھی نہیں چھوڑا کم بختوں نے۔" باسط صاحب بولے۔ "نقدی اور زیور سارا لے گئے۔ وی سی آر بھی اور جو قیمتی چیز نظر آئی' رکھ لی۔ خیر۔" باسط صاحب نے آہ بھری۔ "جان کا صدقہ تھا' جان سے بڑی تو کوئی چیز نہیں۔"

"لیکن شارق پر گولی کیوں چلائی انہوں نے؟" انصاری صاحب نے پوچھا۔

"گرم خون ہے نا جوانی کا' جوش کھا جاتا ہے۔ مزاحمت کر بیٹھا تھا۔" یہ کہتے ہوئے باسط صاحب نظریں چرانے لگے۔

"شارق کا کیا حال ہے؟"

"گولی ران پر لگی تھی۔ ہڈی خدا کا شکر ہے محفوظ رہی لیکن بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے معاملہ خراب ہو گیا۔ اب اللہ کا شکر ہے' بہتر ہے اور خطرے سے باہر ہے۔" باسط صاحب نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

"حماقت کی شارق میاں نے۔ مسلح لوگوں سے نہیں الجھنا چاہیے۔" مصباح صاحب نے کہا۔

"بھائی کیا کرتے۔" طارق نے بھڑک کر کہا۔ اسی لمحے باسط صاحب نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ چپ ہو گیا۔

"بس میاں' جو کچھ بچ گیا' وہ اللہ کی مہربانی ہے۔"

مرزا صاحب نجمہ بیگم کے ساتھ گھر واپس آئے تو بہت چپ چپ تھے۔ دن بھر انہیں چپ لگی رہی۔ رات کو نجمہ بیگم نے ان سے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ چپ کیوں لگ گئی ہے آپ کو؟"

"بس بیگم' کوئی الجھن ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔" مرزا صاحب نے

کہا۔

"اس ڈاکے کا اثر ہے۔"

"ہاں۔ شاید یہی بات ہے۔ بالکل برابر والا گھر ہے۔ دکھ تو ہوگا اور پھر باسط صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"بیچارے۔ بیٹھے بٹھائے یہ آفت آ گئی۔"

"آج کل تو یہ عام بات ہو گئی ہے۔"

نجمہ بیگم کسی سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر بولیں' میں بتاؤں۔ "یہ ڈاکے سے آگے کی بات ہے۔"

"کیا مطلب؟" مرزا بری طرح بھڑکے۔

"بچیوں کی حالت بہت خراب تھی اور باجی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اندر ہی اندر گھٹ رہی ہیں۔"

"معموں میں باتیں کیوں کر رہی ہو؟" مرزا چڑ گئے۔

"بات ہی ایسی ہے' کرنی بھی نہیں چاہیے۔" نجمہ بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس فیملی پر کوئی بڑا سانحہ گزر گیا ہے۔"

"یہ تو سب کو معلوم ہے۔ باسط صاحب خود بتا رہے تھے۔"

"جی نہیں۔ میں اس بات کی بات کر رہی ہوں جو وہ لوگ نہ بتا سکتے ہیں' نہ کبھی بتائیں گے۔"

مرزا کو جو الجھن ستا رہی تھی' وہ اور بڑی لگنے لگی مگر وہ اسے ابھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ انہیں شارق کے متعلق استفسار پر باسط صاحب کا نظریں چرانا یاد آیا' پھر طارق کا بھڑکنا' باسط صاحب کا اسے گھورنا اور طارق کا اچانک چپ ہو جانا یاد آیا۔ اس سے انہیں احساس ہوا تھا کہ کوئی اور بات بھی ہے جو چھپائی جا رہی ہے۔ وہ کیا بات ہے' یہ وہ نہیں سمجھ پائے تھے۔

"ایسی کیا بات ہے؟"

"جو آدمی لٹتا ہے' وہ دوسروں کو ضرور بتاتا ہے لیکن ایک چیز کا لٹنا ایسا بھی ہوتا ہے جس کے بارے میں وہ کبھی کسی کو بتانا نہیں چاہتا۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ ایسی کون سی چیز ہوتی ہے؟"

"حیرت ہے۔ آپ اتنے سمجھدار آدمی ہیں اور یہ بات نہیں سمجھ رہے۔ یہ عزت کی بات ہے۔"

مرزا کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بات پوری طرح ان کی سمجھ میں آگئی۔ جس گھر کی سوچ یہ ہو کہ مال کا غم نہ کیا جائے کہ وہ جان کا صدقہ ہوتا ہے' وہاں جوان خون میں ایسا ابال آنا کہ جان خطرے میں پڑ جائے' ایک غیر معمولی بات ہے مگر سچ یہ ہے کہ عزت جان کا صدقہ نہیں ہوسکتی۔ ہاں عزت پر جان قربان کی جا سکتی ہے۔ "تو اس بات پر شارق نے مزاحمت کی ہوگی جو اسے گولی لگی۔" وہ بڑبڑائے۔

"نجمہ بیگم چونکیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" انہوں نے کہا۔

"ہاں۔ شارق تو اسپتال میں ہے۔"

"مگر باجی نے تو اس کا نام بھی نہیں لیا۔ یہ پتہ چل جاتا تو میں پہلے ہی سمجھ لیتی۔"

"شارق نے مزاحمت کی تھی' اس کی ران پر گولی لگی ہے۔ بہرحال اب وہ خطرے سے باہر ہے۔"

اب کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ نجمہ بیگم ماں تھیں۔ اس بات کی اہمیت سمجھتی تھیں۔ ہر چیز سے زیادہ باجی بیٹے کے لئے تڑپ رہی ہوں گی لیکن انہوں نے یہ پریشانی ظاہر نہیں کی کہ اس طرح عزت کا زخم کھل جائے گا ورنہ ماں کے لئے اولاد کی زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔

دونوں میاں بیوی بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں پڑوس کے المیے کے متعلق سوچتے رہے۔ جو ہوا ہوگا' اس کا تصور کرتے رہے۔ ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ بھی اولاد والے تھے۔ ان کی بھی دو جوان بیٹیاں تھیں۔ دو جوان بیٹے تھے۔ یہی سب کچھ خدانخواستہ ان کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔

اچانک ایک لمحے میں مرزا صاحب نے فیصلہ کیا اور سنا بھی دیا کہ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔

نجمہ بیگم ہکابکا رہ گئیں۔ "کیا.....کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ خدانخواستہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ تو کیا سب لوگ......"

"سب کا مجھے نہیں معلوم۔ نہ مجھے غرض ہے اس سے۔ میں بس اپنی جانتا ہوں۔" مرزا نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔

"بھئی اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔ اب کیا گھر چھوڑ کر....."

مرزا نے پھر ان کی بات کاٹ دی۔ "مشیت پر میرا ایمان بھی ہے لیکن اللہ نے تدبیر کو اہمیت دی ہے اور ہجرت کا حکم بھی اللہ نے دیا ہے۔"

نجمہ بیگم سمجھ گئیں کہ اب مرزا صاحب کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔ "سوچا کیا ہے آپ نے؟" انہوں نے پوچھا۔ "علاقہ تو کوئی بھی محفوظ نہیں۔"

"آپ نہیں سمجھیں۔ ہم اب کوئی فلیٹ لیں گے۔ فلیٹ نسبتاً کافی زیادہ محفوظ ہوتے ہیں۔"

نجمہ بیگم کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بات ہی حیرت کی تھی۔ "لیکن آپ تو فلیٹوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ دڑبا کہتے تھے انہیں۔"

"اب بھی کہتا ہوں لیکن باہر خطرہ ہو تو سیانے پنچھی آزاد فضا پر پنجرے کو ترجیح دیتے ہیں۔" مرزا نے کہا۔ "اور میں پورا شہر چھان ماروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ بالآخر میں مکان جیسا فلیٹ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

اسی روز سے مرزا صاحب فلیٹ کی تلاش میں جت گئے۔ کاروبار پر ان کی توجہ کم ہو گئی۔ زیادہ وقت وہ اپنے مطلب کا فلیٹ ڈھونڈنے میں صرف کرتے۔ وہ دن بہت سخت تھے۔ مرزا سہمے ہوئے بھی تھے۔ اس مکان میں ہر روز قیامت کا تھا۔ مرزا سونے سے پہلے دسیوں بار سب دروازے چیک کرتے۔ پھر رات کو نجانے کتنی بار چونک کر اٹھتے اور پھر دروازے چیک کرتے۔ نجمہ بیگم کو تو شبہ ہونے لگا کہ انہیں رات کو نیند نہیں آتی۔ اس ڈیڑھ ماہ میں ان کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ اس پر ستم یہ کہ ہر روز وہ مایوس لوٹتے۔ نجمہ بیگم کو کبھی ان سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کوئی فلیٹ پسند آیا یا نہیں۔

پھر ایک دن مرزا سہ پہر کو ہی گھر آگئے۔ ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں چمک

رہی تھیں۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انداز بتا رہا تھا کہ انہیں بالآخر کوئی من پسند فلیٹ مل ہی گیا ہے۔

انہوں نے چابیوں کا ایک گچھا نجمہ بیگم کی گود میں ڈال دیا۔ "یہ آپ کے نئے گھر کی چابیاں ہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے آج ہی سب کچھ کر لیا' قبضہ بھی لے لیا ہے۔"

نجمہ بیگم خوش ہو گئیں۔ اپنے لئے نہیں' ان کے لئے۔ خود انہیں تو یہ گھر چھوڑنے کا افسوس تھا۔ بس خوشی اس بات کی تھی کہ اب مرزا صاحب پُرسکون ہو جائیں گے۔ رات کو سکون سے سو سکیں گے اور صحت بہتر ہو جائے گی۔ "مبارک ہو۔" انہوں نے کہا۔

"بغیر دیکھے مبارکباد۔" مرزا برا مان گئے۔ "چلیں میرے ساتھ۔ فلیٹ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔

نجمہ بیگم اسی وقت ان کے ساتھ چل دیں۔ تمام راستے وہ اس فلیٹ کا تصور کرتی رہیں جو مرزا جیسے آدمی کو پسند آیا تھا۔ وہ کوئی عام فلیٹ تو نہیں ہو سکتا۔ کتنا اچھا ہو گا' کیسا ہو گا' یہ تصور بھی ان کے لئے محال تھا۔

مگر زینہ چڑھ کر وہ تیسری منزل پر فلیٹ کے دروازے پر پہنچیں تو مایوس ہو گئیں۔ پھر فلیٹ دیکھ کر ان کی مایوسی دوچند ہو گئی۔ وہ تین بیڈ روم کا خاصا کشادہ فلیٹ تھا۔ شمال اور جنوب سے کھلا ہوا بھی تھا اور دو گیلریاں بھی تھیں مگر تھا وہ عام سا فلیٹ۔ ایسے ہی ہوتے ہیں فلیٹ۔ انہیں مرزا پر ترس آنے لگا۔ خوف نے مرزا کو اس حال کو پہنچا دیا کہ اس فلیٹ کے ملنے پر وہ ایسے خوش ہو رہے ہیں اور ڈیڑھ ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد یہ فلیٹ ملا ہے۔ ارے ایسا فلیٹ تو آدمی ایک دن میں ڈھونڈے اور خرید لے۔ ہا.... کیسا گھر چھوٹ رہا ہے۔ وہ اداس ہو گئیں۔

ادھر مرزا ان کی کیفیت سے بے خبر' بے حد ایکسائیٹڈ انہیں فلیٹ کا معائنہ کرا رہے تھے۔ "یہ کچن دیکھیں۔ ایسا کشادہ اور ہوا دار کچن نکلے گا کہ فلیٹوں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہترین امریکن کچن بنواؤں گا۔ یہاں ڈیپ فریزر بھی رکھا جا سکتا ہے۔"

تشویش سے نجمہ بیگم کا برا حال ہو گیا۔ خدانخواستہ .....انہوں نے سوچا۔ مرزا صاحب کا سچ مچ دماغ چل گیا ہے۔ وہ چھوٹا سا عام کچن تھا۔ ڈیپ فریزر کی اس میں گنجائش ہی نہیں تھی مگر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ سر کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گئیں۔ اس ذہنی کیفیت میں مرزا سے اختلاف کرنا تو مناسب نہیں۔

"یہ ڈرائنگ روم ہے۔ بس بچیوں کی سہیلیاں آگئیں گی تو یہاں بیٹھیں گی اور یہ برابر والا کمرہ بچیوں کا ہے۔"

اب نجمہ بیگم سے رہا نہیں گیا۔ "کمال کرتے ہیں آپ۔ بچیوں کا کمرہ اندر کی طرف ہونا چاہئے۔ آپ گھر میں گھستے ہی جو پہلا کمرہ ہے' وہ انہیں دے رہے ہیں اور وہ بھی ڈرائنگ روم کے برابر والا کمرہ۔"

"کہا نا' ڈرائنگ روم صرف بچیوں کے مہمانوں کے لئے ہے۔" مرزا صاحب نے بڑے تحمل سے کہا اور پھر یہ کمرہ تو گھر کے سب سے اندر والے حصے میں ہے۔

نجمہ بیگم اور گھبرا گئیں۔ مرزا صاحب' تو لگتا تھا بالکل ہی کھسک گئے ہیں۔ سب سے باہر کے کمرے کو سب سے اندر والا کہہ رہے تھے۔

"اور یہ دوسرا کمرہ عبادت کا۔" مرزا صاحب نے دوسرے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ پھر تیسرے بیڈ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "اور یہ ہے ریسٹ روم۔"

نجمہ بیگم نے سر پکڑ لیا۔ اپنے لئے اور لڑکوں کے لئے بیڈ روم کی ضرورت نہیں اور عبادت کا کمرہ اور ریسٹ روم کیا جا رہا ہے۔ کیا اس گھر میں صرف بچیاں ہی رہیں گی۔ ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اب تو وہ احتجاج کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ تو دل ہی دل میں مرزا کی عافیت کی دعا کر رہی تھیں۔

"اور ٹی وی لاؤنج دیکھو۔ بہت بڑا ہے ناں۔ اس کے لئے 27 انچ کا ٹی وی لانا پڑے گا۔"

"27 انچ کا ٹی وی! اس لاؤنج کے لئے؟"

"کیوں؟ کیا چھوٹا رہے گا؟" مرزا نے بے حد معصومیت سے کہا۔ پھر خود ہی بولے۔ "نہیں بھئی 27 انچ سے زیادہ کا اچھا نہیں لگے گا۔"

"میرا مطلب ہے' لاؤنج اتنا بڑا تو نہیں۔"

"تو کیا چھوٹا ہے۔" مرزا برا مان گئے۔ "34 بائی 14 کا ہے۔"

نجمہ بیگم کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے کہہ سکتی تھیں کہ مرزا سائز ڈبل کر کے بتا رہے ہیں۔ یہ لاؤنج ان کے بیان کے مقابلے میں آدھا بھی نہیں۔ اب انہیں فلیٹ سے وحشت ہونے لگی۔ وہ فوری طور پر وہاں سے نکل جانا چاہتی تھیں۔

"اب چلیں۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں چلیں۔"

نیچے آ کر وہ گیٹ کی طرف مڑیں تو مرزا نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہاں کہاں جا رہی ہیں؟

باہر کا راستہ اسی طرف ہے ناں؟

وہ تو ہے مگر ابھی آپ نے پورا فلیٹ کہاں دیکھا ہے؟

نجمہ بیگم کو لگا کہ ان کا دماغ بھی چل گیا ہے۔ لو..... کیا فلیٹ کے بھی دو حصے ہونے لگے۔ ایک مشرق میں' دوسرا مغرب میں مگر وہ مرزا کی ذہنی کیفیت کی طرف سے پہلے ہی متوحش تھیں۔ خاموشی سے مرزا کا ساتھ دینے ہی میں عافیت نظر آ رہی تھی۔

مرزا صاحب انہیں لے کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف چل دیئے۔ جس زینے سے وہ اترے تھے' اس کے بعد صرف ایک فلیٹ تھا اور اس سے دو فٹ آگے عمارت کی عقبی باؤنڈری وال نظر آ رہی تھی۔ نجمہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فلیٹ کا دوسرا حصہ کہاں نمودار ہوگا۔ اس کا کوئی امکان تو نظر نہیں آ رہا تھا۔

لیکن اس فلیٹ کی حد پار کرتے ہی ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس فلیٹ کے پہلو میں عمارت کی عقبی سمت ایک بہت خوبصورت اور کھلا زینہ تھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں ہر فلور پر صرف ایک فلیٹ تھا۔

وہ زینہ چڑھنے لگیں اور انہیں اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اس بار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہیں تھکن بھی نہیں ہوئی۔ تیسری منزل کی لینڈنگ پر رک کر انہوں نے نیچے دیکھا۔ ریلنگ کے عین نیچے باؤنڈری وال نظر آ رہی تھی۔ سامنے بارونق بازار تھا۔ ان کا دل خوش ہو گیا۔

وہ اوپر چڑھیں۔ تیسری منزل کے فلیٹ کے دروازے میں چابی لگاتے ہوئے مرزا نے انہیں فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ "کہئے' جی خوش ہوا یا نہیں؟"

"واقعی.....میں تو باہر سے ہی دیکھ کر خوش ہو گئی۔"

"ورنہ اس سے پہلے تو آپ مجھے پاگل ہی سمجھ رہی تھیں۔ ہے ناں؟"

نجمہ بیگم کھسیا گئیں۔ "خیر.....ایسا تو نہیں۔"

مرزا نے دروازہ کھولا اور دونوں فلیٹ میں داخل ہوئے۔ "فلیٹ بھی آپ نے دو ہی خریدے۔" نجمہ بیگم مسکرائیں۔

"یہ تو میرے ساتھ ہوتا ہی ہے.....بیوی کے سوا۔" مرزا بھی مسکرائے "لیکن یہ کہنے کو دو ہیں۔ اصل میں ایک ہی فلیٹ ہے۔"

اس بار نجمہ بیگم کی سمجھ میں بات آ گئی۔ دونوں فلیٹوں کے کچن اور ٹی وی لاؤنج ملے ہوئے تھے۔ بیچ کی دیوار ٹوٹتی تو.....واقعی ٹی وی لاؤنج بھی بہت بڑا تھا اور کچن بھی۔ مغرب کی طرف کھلے دروازے سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ پنکھے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"میں بات کر چکا ہوں۔ یہ دیوار ٹوٹ جائے گی تو دونوں فلیٹ ایک ہو جائیں گے۔" مرزا نے دیوار کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

نجمہ بیگم نے دیوار گرائے جانے کے بعد کے کچن اور ٹی وی لاؤنج کا تصور کیا تو ان کا دل خوش ہو گیا۔ اب ان کی سمجھ میں مرزا صاحب کی ہر بات آ رہی تھی۔ بچیوں کا کمرہ' ان کا ڈرائنگ روم......واقعی وہ تو گھر کے نہایت اندرونی حصے میں تھے اور یہاں اب چھ بیڈ روم تھے۔ بہت کشادہ تھا ان کا گھر۔

"واقعی...... آپ نے کمال کر دیا۔" انہوں نے واپسی پر شوہر سے کہا۔ "آپ نے ایک ایسا فلیٹ ڈھونڈ لیا جو مکان سے بھی بہتر ہے۔"

مرزا کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

بچوں کو بھی اپنا نیا گھر بہت پسند آیا۔ پرانا گھر چھوٹنے کا زیادہ ملال بھی نہیں ہوا۔ پھر اسی گھر میں اللہ نے انہیں خوشیاں بھی بے حساب دیں۔ فلیٹ میں آئے انہیں تیسرا سال تھا کہ دونوں بیٹیوں کی شادی ہو گئی اور تین سال بعد وہ بہوئیں بھی لے آئے۔ اب وہ پوتے پوتیوں والے تھے۔

"یہ ہے اس فلیٹ کی کہانی۔" نجمہ بیگم نے کہا۔

ثمینہ ہنسنے لگی۔ "سچ مچ کہانی ہی لگتی ہے۔"

"اور ہم نے بچپن میں جو پریوں کی کہانیاں سنی تھیں' ابو ان کہانیوں والے مہربان بزرگ لگتے ہیں۔" روبینہ نے کچن سے باہر آتے ہوئے کہا۔

نجمہ بیگم کی نظر دیواری گھڑی کی طرف اٹھی۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ بارہ بج رہے تھے اور مرزا صاحب ابھی تک نہیں اٹھے تھے۔ "ان کو کیا ہو گیا ہے آج۔" وہ بڑبڑائیں۔ "بارہ بج رہے ہیں۔"

"رات بھر سوئے بھی تو نہیں۔" روبینہ بولی۔

"پھر بھی' اتنی دیر تک سونے والے نہیں ہیں۔ زندگی میں کبھی اتنی دیر سے نہیں اٹھے۔"

"تکلیف بھی تو بہت تھی۔"

نجمہ بیگم کو پہلی بار احساس ہوا کہ مرزا بوڑھے ہو گئے ہیں۔ پہلے رات بھر جاگتے بھی تھے دو گھنٹے کی نیند لے کر تازہ دم ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے بوڑھے ہونے کا احساس بھی ہونے لگا۔ تو اور کیا' انہوں نے خود سے کہا۔ سدا جوان کون رہتا ہے اور یہ نیند تو شکر کی بات ہے ورنہ بڑھاپے میں بیشتر لوگوں کی تو نیند کم ہو جاتی ہے۔ کچھ تو ترس جاتے ہیں نیند کو۔ مرزا سو رہے ہیں تو خوشی کی بات ہے اور پھر نیند بھی وہ جو شدید تکلیف کے بعد آئی ہو۔

اسی لمحے بیڈ روم کی طرف سے آنے والی آوازوں سے انہیں اندازہ ہوا کہ مرزا جاگ چکے ہیں۔

○

مرزا نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور خودکار انداز میں کلاک کو دیکھا۔ کلاک کو دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ "ارے.....بارہ بج گئے۔ وہ بڑبڑائے۔ لاحول ولا.....یہ بھی کوئی وقت ہے جاگنے کا۔"

نیند ان کی آنکھوں سے کافور ہو گئی تھی۔ قرآن پڑھنا ہے۔ پھر ظہر پڑھنی ہے اور ابھی تو ناشتہ بھی کرنا ہے۔ ناشتے پر انہیں دانت صاف کرنے کا خیال آیا اور اس پر داڑھ کی تکلیف یاد آئی۔ سانس روک کر انہوں نے درد کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ پھر اطمینان کی گہری سانس لی کیونکہ درد سو رہا تھا مگر دانت صاف کرنے کے خیال سے انہیں خوف آنے لگا۔ انہیں یقین تھا کہ انگلی متورم مسوڑھے کو چھو بھی جائے گی تو درد جاگ اٹھے گا لیکن بہرحال اس سے تو مفر نہیں۔ دانت تو صاف کرنے ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے ناشتے سے تو دستبردار ہوا جا سکتا ہے لیکن نماز سے تو نہیں اور نماز کے لئے وضو کرنا لازمی ہے۔

سو کر اٹھنے کے بعد باتھ روم جانا آدمی کے لئے اتنا ہی نیچرل ہوتا ہے جتنا سانس لینا اور مرزا صاحب کے لئے تو وہ زیادہ ہی نیچرل تھا۔ وہ تو اٹھتے ہی سوچے سمجھے بغیر باتھ روم میں گھس جاتے تھے مگر اس روز انہیں گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ چند منٹ کی ہچکچاہٹ کے بعد بہرحال انہوں نے اس حقیقت کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

باتھ روم میں ان کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی ہمیشہ کی طرح چوزی اندر گھس چکا تھا۔ "باہر نکلو۔" انہوں نے سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔

وہ سر اٹھا کر معصومیت سے انہیں دیکھتا رہا۔

"تم معصوم ہو' ناسمجھ ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے ساتھ باتھ روم میں چلے آؤ۔ چلو.....باہر نکلو باہر۔" مرزا نے انگلی سے اشارہ کیا۔

لیکن چوزی ایسے باہر نکلنے والا نہیں تھا۔ اس نے سر جھکایا اور واش بیسن کے نیچے اپنی جستجو شروع کر دی۔

ہمیشہ کی طرح مرزا صاحب نے زبردستی اسے باہر نکالا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چند منٹ بعد انہوں نے دروازہ کھولا۔ اب انہیں دانت صاف کرنے کا سخت

مرحلہ درپیش تھا۔ وہ اس کے لئے ہمت مجتمع کر رہے تھے۔

دروازہ کھولتے ہی انہیں احساس ہوا کہ چوزی بند دروازے پر دربان کی طرح کھڑا رہا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آیا اور بیسن کے نیچے چلا گیا۔ وہ باتھ روم میں اس کی سب سے پسندیدہ جگہ تھی۔

"ہاں۔ اب کوئی حرج نہیں۔ اب تم اندر آسکتے ہو۔" مرزا صاحب نے طمانیت سے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یار تم طبعاً "گندے ہو۔ اول تو باتھ روم میں کوئی بلا ضرورت جاتا نہیں اور جائے بھی تو بیسن کے نیچے کوئی نہیں گھستا۔"

چوزی ان کی باتوں سے بے نیاز اپنے شغل میں لگا رہا۔

مرزا صاحب نے ٹیوب کھول کر انگلی پر تھوڑا سا پیسٹ لیا۔ دانت برش کرنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو تو انگلی سے دانت ملنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بار بار انگلی منہ کی طرف جاتی مگر وہ فوراً ہی اسے کھینچ لیتے۔

آواز سن کر انہوں نے نیچے دیکھا۔ چوزی سر اٹھائے انہیں دیکھ رہا تھا۔ "یار چوزی، تم بہت تیز ہو۔" انہوں نے کھسیا کر کہا۔ "کیسے سمجھ لیتے ہو سب کچھ؟"

چوزی خاموش رہا۔ بس سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

"تم گھر میں سب سے چھوٹے ہو۔ تمہیں تو کسی سے بھی بازپرس کا حق نہیں۔ کجا یہ کہ گھر کے سب سے بڑے سے باز پرس...."

چوزی کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مرعوب ہونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی نظروں میں اب بھی سوال تھا۔

اس ننھے سے چوزی کے سامنے مرزا صاحب خود کو اس سے بھی چھوٹا محسوس کرنے لگے۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ دانت تو مجھے صاف کرنے ہیں....اور میں کروں گا۔" انہوں نے اکڑ کر کہا۔ "میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں کہ دانت صاف کرنے سے ڈروں۔"

چوزی انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے دل کڑا کر کے منہ کھولا اور پیسٹ کو انگلی کی مدد سے بڑی نرمی سے دانتوں پر ملا۔ چوزی نے طمانیت بھرے انداز میں سر جھکایا اور دوبارہ اپنے شغل میں لگ گیا۔

مرزا صاحب نے بڑی نرمی سے ملا تھا لیکن انگلی کے لمس نے دکھتی ہوئی داڑھ اور مسوڑھے میں سوئے ہوئے درد کو جگا دیا۔ وہ بے ساختہ کراہے اور دوسرے ہاتھ سے متورم رخسار کو سہلانے لگے۔

چوزی نے پھر سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس بار اس کی نظروں میں تشویش تھی۔

مرزا باہر نکل آئے۔ انہوں نے سوچا۔ اچھا ہے پیسٹ چند منٹ لگا رہے۔ اس سے بھی تکلیف کچھ کم ہوگی۔ پھر کلی کرلیں گے۔ چوزی بھی نکل آیا تھا اور اب ان کے ساتھ تقریباً پیروں سے لپٹا ہوا چل رہا تھا۔

وہ لاؤنج میں آئے۔ اسی وقت نجمہ بیگم کچن سے نکلیں۔ "تکلیف کچھ کم ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"اس وقت تو بہت ہے۔" مرزا منمنائے۔ پیسٹ کی وجہ سے ان کا بات کرنا مشکل تھا۔

"ناشتہ کریں گے؟"

مرزا نے انکار میں سرہلایا۔ ایسی تکلیف میں کوئی کھانے پینے کا کیسے سوچ سکتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔

"میں نے حلوہ بنایا ہے آپ کے لئے۔" ثمینہ بھی کچن سے نکلی۔

مرزا مسکرائے۔ حلوہ اور وہ بھی بہو کے ہاتھ کا۔ انہوں نے جلدی سے اثبات میں سرہلایا۔ وہ انگلی سے متورم رخسار کو سہلائے جا رہے تھے۔

بس تو آپ کلی کرکے آئیں۔ میں ناشتہ لگا رہی ہوں۔ ثمینہ بولی۔

مرزا باتھ روم میں جانے کے لئے پلٹے تو کسی نادیدہ ڈور سے بندھا چوزی بھی پلٹا۔ "ارے.....تو ان کے ساتھ ہی لگا رہے گا؟" نجمہ بیگم نے اسے پکارا۔ "صبح سے چپکا ہوا ہے۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔"

مگر چوزی کہاں سننے والا تھا۔ وہ تو مرزا صاحب کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

مرزا باتھ روم سے آئے تو ان کی داڑھ میں تکلیف ہو رہی تھی مگر پہلے کے مقابلے میں بہت کم اور قابل برداشت اور بھوک کا احساس بہت شدید تھا۔ لاؤنج میں آتے ہی انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ ناشتہ لگا رہی ہو! انہوں

نے ثمینہ سے کہا۔

"ناشتہ لگا دیا ہے ابو۔ ڈائننگ ٹیبل پر۔"

"تم جانتی ہو' مجھے نیچے بیٹھ کر کھانا پسند ہے۔"

"مگر ابو' یہاں چوزی آپ کو پریشان کرے گا۔" ثمینہ نے کہا۔

"لائٹ گئی ہوئی ہے۔ ایسے میں ڈائننگ روم میں کچھ کھانا ناممکن ہے۔" مرزا صاحب بولے۔ "اور جہاں تک چوزی کا تعلق ہے تو آج میرے ساتھ ناشتہ کرنا اس کا حق ہے۔ میں سوتا رہا اور یہ میرے سرہانے بیٹھا رہا۔ صبح سے بھوکا ہے بیچارہ۔"

"واقعی.....یہ تو ہے۔ نجمہ بیگم نے تائید کی۔ اس نے تو حد ہی کر دی۔"

مرزا صاحب خود اس بات پر حیران بھی تھے اور خوش بھی۔ ان کی طرح چوزی بھی معمولات کا بڑا پکا تھا۔ صبح جب بچے جاگتے اور اسکول کے لئے تیار ہوتے تو وہ بھی اپنے بستر سے نکل آتا مگر باہر نکلنے کے بجائے وہ سب سے پہلے ان کے کان میں گدگدی کرتا....اور اس وقت تک کرتا جب تک وہ اٹھ نہ جاتے۔ ان کے اٹھنے کے بعد ناشتہ کرنے تک وہ ان کے پیچھے لگا رہتا اور پھر کچن میں جا گھستا۔ صبح اسے بھوک پیاس بہت لگتی تھی مگر آج ان کے معمولات ڈسٹرب ہوئے تھے اس نے بھی اپنے معمولات ترک کر دیئے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کتنا بھوکا ہو گا بیچارہ۔

ثمینہ نے دسترخوان بچھایا' پلیٹیں اور چمچے لا کر رکھے۔ پھر اس نے چوزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب اس کی بدتمیزیاں شروع ہو جائیں گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا' تم لاؤ تو۔" مرزا صاحب نے کہا۔ پھر پاس منڈلاتے ہوئے چوزی کی طرف متوجہ ہوئے۔ "دیکھو.....جانوروں کی طرح ٹوٹ مت پڑنا۔ میری بے عزتی نہ کروا دینا ورنہ مرمت ہو جائے گی تمہاری۔"

ثمینہ نے حلوے کی قاب لا کر دسترخوان پر رکھ دی۔ مرزا صاحب نے ادھر ادھر دیکھا۔ "تو میں اکیلا.....؟" انہوں نے سوال اٹھایا۔

"سب ناشتہ کر چکے ہیں ابو۔" ثمینہ نے کہا۔ پھر ہنس دی "اور اکیلے کہاں' چوزی بھی آپ کے ساتھ ہے۔"

مرزا صاحب نے قاب کا ڈھکنا اٹھایا۔ بھوک ویسے ہی بہت شدید تھی۔ حلوے

کی خوشبو نے انہیں بے حال کر دیا۔

"میں نے ٹھنڈا کیا ہے حلوے کو۔" ثمینہ نے بتایا۔ "آپ کی داڑھ کی وجہ سے ورنہ حلوہ تو گرم ہی مزا دیتا ہے۔" اس نے چوزی کی چھوٹی سی پلیٹ بھی دسترخوان پر رکھ دی۔ "پھر بھی آپ دیکھ لیں' بالکل ٹھنڈا نہیں ہے۔"

مرزا صاحب نے انگلی سے حلوے کو چھو کر دیکھا۔ وہ اب بھی گرم تھا۔ شاید ان کی داڑھ اسے برداشت نہ کر سکے۔ ادھر چوزی بے تاب ہو کر پلیٹ پر چڑھا جا رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ سے اسے ہٹایا۔ "پرے ہٹو' تمیز سے بیٹھو ورنہ پٹائی ہو جائے گی۔" انہوں نے اسے ڈانٹا۔ وہ دبک کر بیٹھ گیا۔

مرزا صاحب نے پلیٹ اپنے سامنے رکھی اور اس میں حلوہ نکالا۔ "تم فکر نہ کرو چوزی' پہلے تمہیں ناشتہ کراؤں گا' پھر خود کروں گا۔" انہوں نے کہا اور چمچے میں الگ سے حلوہ نکال کر سامنے رکھ لیا۔

"اب اسے ناشتہ کرائیں گے۔ حلوہ کھلائیں گے۔" نجمہ بیگم نے اعتراض کیا۔

"کیوں نہیں کھلا سکتے؟"

"کیسے کھلائیں گے؟"

"جیسے اماں سے گندھا ہوا آٹا کھلاتی ہیں.....چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر۔"

"حلوے اور گندھے ہوئے آٹے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ابھی دیکھ لینا۔"

"اچھا' اسے میں کھلا دیتی ہوں۔ آپ ناشتہ کر لیں سکون سے۔" نجمہ بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔

"آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ میں ایثار کر رہا ہوں اس کے لئے۔" مرزا صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ "نہیں نجمہ بیگم' آدمی بڑا خودغرض ہوتا ہے۔ حلوہ گرم ہے اور مجھے اس کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرنا ہے۔ اتنی دیر اس طرح وقت گزاری کروں گا۔ چوزی پر احسان الگ۔"

اس دوران میں چوزی بے تابی سے دسترخوان کا طواف کیے جا رہا تھا۔ کبھی وہ بے تاب ہو کر دسترخوان پر چڑھنے کا ارادہ کرتا مگر مرزا صاحب کو دیکھتا اور خود کو

روک لیتا۔ اس کا بہت برا حال تھا۔

مرزا صاحب حلوے کی ننھی منی گولیاں بنا کر چوزی کی پلیٹ میں ڈالنے لگے۔

آؤ.... کھاؤ مگر ذرا تمیز سے۔

اجازت ملتے ہی چوزی اپنی پلیٹ پر پل پڑا۔ اس کی بے تابی کا یہ عالم تھا کہ وہ پلیٹ پر چڑھ گیا۔ فوراً ہی حلوے کی ایک گولی لے کر وہ قالین پر آگیا۔

"یہ کیا گندگی ہے۔ پلیٹ کس لئے ہے؟" مرزا صاحب بلبلائے مگر اب چوزی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

پندرہ بیس گولیاں بنانے کے بعد مرزا صاحب اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ حلوہ واقعی مزے کا تھا۔

○

ناشتے کے بعد مرزا صاحب معمول کے مطابق اماں کے پاس جا بیٹھے۔ اماں کی مزاج پرسی کی۔ "مجھے چھوڑ منے۔ اپنی سنا۔" اماں نے کہا۔ "آج اتنی دیر سے سو کر اٹھا ہے' داڑھ میں بہت تکلیف ہو رہی تھی؟"

اب ایک اماں ہی رہ گئی تھیں مرزا صاحب کو منے کہنے والی اور مرزا صاحب کو یہ بہت اچھا لگتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر دعا سے پہلے اماں کی درازی عمر کے لیے دعا کرتے تھے۔ بڑے سر پر موجود ہوں تو آدمی کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیتے۔ اماں کی عمر 90 کے لگ بھگ تھی اور وہ آج بھی بڑے دبدبے سے ڈانٹتی تھیں اور مرزا دبک کر رہ جاتے تھے۔ گھر کی سربراہ آج بھی اماں ہی تھیں۔

"ہاں اماں۔ بہت تکلیف ہے۔ اب تو ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔" مرزا صاحب نے کہا۔

"ادھر دکھا مجھے۔"

مرزا نے چہرہ اماں کے قریب کیا۔ اماں نے ان کے متورم رخسار کو بڑی نرمی سے چھوا۔ "ارے منے..... کتنی سوجن ہے۔ تو تو رات بھر نہیں سو سکا ہوگا۔"

ساٹھ سال پرانا' جانا پہچانا مامتا بھرا لمس' محبت بھرا لہجہ' فکرمندی اور دکھ سے چھلکتا ہوا۔ مرزا صاحب کو لگا کہ وہ چھوٹے سے بچے ہیں۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ساری رات تکلیف رہی ہے اماں۔ بہت تکلیف ہے۔" ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔"

"تو مجھے کیوں نہیں بلا لیا؟" اماں نے تڑپ کر کہا۔

"آدھی رات کو کیا تکلیف دیتا اماں۔ ساری عمر تو آپ نے میری تکلیفیں اٹھائی

ہیں۔ میرے لیے زحمت کرتے عمر گزر گئی آپ کی۔"

"ارے پگلے' ماں ہوتی ہی اس لیے ہے اور میں کون سا سوتی ہوں رات کو۔ صبح ہوتے نیند آتی ہے۔ روز کا معمول ہے۔ لا..... دم کر دوں۔ انشاء اللہ تکلیف کم ہو جائے گی۔"

"دور نہیں ہو سکتی؟" مرزا صاحب نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

دم کرتی ہوئی اماں نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔ وہ خاموشی سے پڑھتی رہیں۔ دم کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "دور کیسے ہوگی؟ پھانس اندر رہے گی تو آرام کیسے آئے گا۔ پھانس نکلے تو آرام آتا ہے۔ تو یہ داڑھ نکلوا کیوں نہیں دیتا ہے؟"

"کیسے نکلوا دوں اماں۔ اتنی عمر کا ساتھ ہے اور پھر تکلیف دونوں طرف کی داڑھوں میں ہے۔ شکر ہے کہ ایک وقت میں دونوں طرف نہیں ہوتی۔"

"کیسی بچوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ اتنی عمر کا تکلیف دہ ساتھ ہو تو اسے ختم نہیں کیا جاتا۔" اماں کے لہجے میں ملامت تھی۔

"اماں' مجھ سے اپنی کوئی چیز چھوڑی نہیں جاتی۔ یہ میری داڑھ ہے' جس سے میں ہڈیاں تک چباتا رہا ہوں۔"

"کوئی چیز نہیں رہتی آدمی کے پاس۔ کبھی چیزیں اسے چھوڑ جاتی ہیں اور کبھی وہ چیزوں کو چھوڑ جاتا ہے۔" اماں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "اب تک یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید میرے بعد سمجھ میں آئے......"

مرزا نے تڑپ کر اماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی باتیں نہ کریں اماں۔"

"بس تو یہ دونوں داڑھیں نکلوا دے۔ جو چیز کام کی نہ رہے اور الٹا تکلیف دینے لگے' اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ نکالتے وقت بہت تکلیف ہوگی۔"

"اس سے کم ہی ہوگی جو تو اٹھا رہا ہے اور جو اب اٹھا رہا ہے۔ اس کا کچھ حاصل نہیں۔ جو نکلوانے میں تکلیف ہوگی تو اس کے بعد آرام بھی آجائے گا۔" اماں نے جھنجھلا کر کہا۔ "بس آج یہ فساد ختم کر دے۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ آج شاید ظفر ڈاکٹر سے وقت لے لے گا۔"

اسی وقت چوزی کمرے میں آگیا۔ وہ مرزا صاحب کے پیروں پر چونچیں مارنے لگا جیسے انہیں اپنی طرف متوجہ کر رہا ہو۔ مرزا نے سر جھکا کر اسے دیکھا' "کیا ہے چوزی؟ دیکھتے نہیں' میں اماں سے بات کر رہا ہوں۔"

"ارے منے' وہ جانور ہے۔ وہ کیا سمجھے گا۔" اماں نے کہا۔

"جانور تو ہے اماں لیکن سب کچھ سمجھتا ہے۔"

"تو تو پگلا ہے۔ جانور سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہیں سمجھتے۔"

"مگر یہ سمجھتا ہے اماں۔ اپنے جیسوں میں رہا جو نہیں ہے۔" مرزا نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

اماں اب انہیں بہت محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ "آدمی کتنا بدل جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ تو جانوروں کو ناپسند کرتا تھا۔ ظفر اور آفتاب کو بچپن میں چوزوں کا شوق ہوا تو تو نے کتنی مخالفت کی تھی۔"

"صرف آپ کی وجہ سے چپ ہو گیا تھا۔"

"چپ کیا ہو گیا تھا! ہر وقت غصہ کرتا تھا کہ گھر کو مرغی خانہ بنا دیا ہے۔" اماں نے ہنس کر کہا اور اب دیکھو' فلیٹ میں چوزے پل رہے ہیں۔ فلیٹ میں مرغیاں تو کوئی بھی نہیں پالتا...... سوائے تیرے۔

"تو میں بھی کب پالتا ہوں۔ بچوں کے شوق سے مجبور ہو گیا ہوں اور دیکھ لیں' بڑے ہو گئے تو بھجوا دیئے آپا کے ہاں۔"

"میں پوتوں کے لاڈ کرتی تھی تو غصہ کرتا تھا کہ اماں بچوں کو بگاڑ رہی ہیں۔" اماں نے مزے لیتے ہوئے کہا۔ "اور اب خود اپنے پوتوں کو بگاڑ رہا ہے۔"

"آپ کی بات سمجھ میں آگئی۔ دادا' دادی کے پیار سے بچے نہیں بگڑتے اور پوتے پوتیوں کی ضد پوری نہ کرنا ناممکن اور بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔" مرزا کو بیتے دن یاد آنے لگے "مگر اماں' آپ کی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی اب تک۔ آپ کہتی تھیں کہ جانور ضرور پالنا چاہیئے گھر میں۔ کوئی پریشانی آئے' گھر میں کسی کو خطرہ ہو تو جانور اپنے مالک پر قربان ہو جاتا ہے۔ یہ کیسی بات ہے۔"

"سچی بات ہے۔ سو بار آزمائی ہوئی لیکن تو جب تک دیکھے گا نہیں' مانے گا بھی

نہیں۔"

چوزی پھر کمرے میں آیا اور ان کے پیروں پر ٹھونگیں مارنے لگا۔ "ابھی چلتے ہیں چوزی میاں!" انہوں نے محبت سے اسے سمجھایا۔

اماں انہیں بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تو یہ کہتا ہے کہ پوتوں کی محبت میں تو نے چوزوں کی اجازت دی؟" ان کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"یہ سچ ہے اماں۔"

"مگر یہ تیرا چوزی..... یہ پوتوں کا تو نہیں ہے۔"

مرزا کھسیا گئے۔ "ہے تو انہیں کا اماں لیکن مجھ سے لپٹ گیا ہے۔ آپ دیکھیں، اس سے پہلے والوں کو تو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا تھا..."

مرزا اماں کے پاس سے اٹھے تو ان چوزوں کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ انہیں وہ دن خوب اچھی طرح یاد تھا۔

○

وہ دسمبر کا مہینہ تھا..... اب سے آٹھ ماہ پہلے کی بات۔ وہ بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں پوتوں کو کرکٹ سکھا رہے تھے۔ یہ ان کا شام کا معمول تھا۔

اچانک آمنہ دوڑتی ہوئی آئی۔ "دادا، دادا..... آپ کو دادی بلا رہی ہیں۔"

"ان سے کہہ دو، تھوڑی دیر بعد آئیں گے۔" مرزا صاحب نے جھونک میں کہا۔

"چلئے ناں دادا۔" آمنہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ٹھنکنے لگی۔

مرزا صاحب کو کچھ خیال آگیا۔ نجمہ بیگم کبھی انہیں یوں نہیں بلواتی تھیں۔ کوئی بات ہوگی، تب ہی بلوایا ہے۔ وہ پریشان ہو گئے۔ "چلو بھئی چلو، آج کا کھیل ختم۔" انہوں نے اعلان کیا۔

"مگر دادا، ابھی تو مغرب میں دیر ہے۔" اشفاق نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ کل زیادہ کھیل لیں گے۔" انہوں نے اسے بہلایا۔

"ٹھیک ہے دادا۔" مشتاق بولا۔ پھر اشفاق کی طرف مڑا۔ "بھائی آپ کو وعدہ یاد نہیں، دادا کی ہر بات ماننی ہے۔"

وہ بچوں کو لے کر اوپر چلے آئے۔ "کیا بات ہے بیگم؟ خیریت تو ہے؟" انہوں نے نجمہ بیگم سے پوچھا۔

"خیریت ہے۔ چوک پر آج بدھ بازار لگا ہوگا۔ کچھ چیزیں ختم ہو گئی ہیں۔ جا کر لے آیئے۔"

وہ بھنا گئے۔ "اس کے لئے آپ نے مجھے نیچے سے بلوایا ہے۔ آپ کو معلوم ہے، یہ بچوں کا وقت ہے۔"

نجمہ بیگم کو ان سے کام لینا آتا تھا۔ "سوری، یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" انہوں نے بہت میٹھے لہجے میں معذرت کی۔ "اور ایسا کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ دونوں بہوؤں میں سے کسی ایک کو بھیج دوں گی۔"

اس پر مرزا بری طرح بدکے۔ "انہیں رہنے دو۔ پورے دن کی تھکی ہوئی ہوں گی۔"

"میری کمر میں درد نہ ہوتا تو میں خود چلی جاتی۔" نجمہ بیگم نے لہجے میں بیچارگی سموتے ہوئے کہا۔

"تو اب تو میں آگیا ہوں نا۔ چلا جاؤں گا۔" مرزا صاحب کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"ٹھیک ہے دادا۔ ہم بھی چلیں گے۔ بچے ایک آواز ہو کر چلائے۔"

سو مرزا بچوں کو لے کر بازار چلے گئے۔ پرچے کی تمام چیزیں خریدنے کے بعد انہیں بچوں کو کچھ دلانے کی فکر ہوئی مگر یہ بڑا مسئلہ تھا۔ چاروں بچے اپنی اپنی ہانک رہے تھے..... میں یہ لوں گا..... میں یہ..... میں یہ لوں گی اور لطف یہ تھا کہ ان چیزوں کا بازار میں وجود ہی نہیں تھا۔ "بھئی ایسی چیزوں کی فرمائش کرو جو یہاں ملتی ہیں۔" انہوں نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں دادا، یہاں نہیں ہیں تو باہر سے لے لیں گے۔" نو سالہ آفاق بولا۔

مرزا پریشان ہو گئے۔ اب یہ بچے نہ جانے کہاں کہاں لے کر پھریں گے۔ "نہیں بیٹے! یہیں سے لے لو، جو لینا ہے۔"

انہوں نے بازار کے دو چکر لگا لئے لیکن بچوں کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

بچوں کی سمجھ میں ایسے میں کہاں کچھ ہوتا ہے۔ دھیان ایک طرف ہوتا ہی نہیں۔ کبھی سوچتے ہیں‘ یہ لے لو۔ کبھی سوچتے ہیں‘ وہ ٹھیک رہے گا۔

مرزا صاحب کو ظفر اور آفتاب کا بچپن یاد آ گیا۔ ان کے ساتھ یہی سب کچھ ہوتا تھا مگر اس وقت وہ جھنجلا جاتے تھے۔ ”کچھ لینا ہے تو لو ورنہ گھر چلو۔ کل اپنی امی کے ساتھ بازار چلے جانا۔“ وہ انہیں ڈانٹ کر کہتے تھے۔ ”تمہیں ہماری تھکن کا خیال ہی نہیں۔“

اور اب یہ بیٹوں کے بیٹے تھے۔ وہ انہیں لئے بے سود پھر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ کچھ بھی نہیں لیں گے اور انہیں تھکن بھی ہو رہی تھی لیکن اندر کوئی جھنجلاہٹ نہیں تھی۔ انہیں ڈانٹنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

انہوں نے پہلو کی طرف دیکھا۔ وہاں صرف تین بچے تھے۔ ”ارے.....یہ مشتاق کہاں گیا؟“ انہوں نے گھبرا کر کہا۔

اسی لمحے کچھ فاصلے سے مشتاق کی آواز آئی۔ ”دادا......دادا......میں تو یہ لوں گا۔“

انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ مشتاق کوئی دس قدم پیچھے کھڑا تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے تینوں بچے اسی طرف دوڑ گئے۔ ان کے انداز میں اشتیاق تھا۔ مرزا صاحب بھی اسی طرف چل دیئے۔

وہاں پہنچ کر مرزا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ایک ہندو عورت تھی جس کے پاس رنگ برنگے ننھے منے چوزے تھے اور اب چاروں بچے اشارے کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہم تو یہ لیں گے۔

مرزا صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ یہ تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا لیکن ان کے گھبرانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ انہیں چوزے دلانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو انہیں خیال بھی نہیں آیا البتہ انہیں یہ ضرور یاد آیا کہ ظفر اور آفتاب ان سے چھپ کر چوزے پالتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر غصہ کرتے رہتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اماں نہ ہوتیں تو وہ چوزوں کو گھر سے نکال پھینکتے۔

مگر اب انہیں پوتوں کے چوزے پالنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں یہ ڈر تھا

کہ اس پر گھر میں ایک مباحثہ شروع ہوگا۔ بیٹے شکایت کریں گے کہ ان کے لئے سختی ہی سختی تھی اور ان کے بچوں کے لیے نرمی ہی نرمی ہے۔

”تمہیں میں بیٹری سے چلنے والا جہاز لے کر دوں گا۔ انہوں نے مشتاق کو لالچ دیا۔“

نہیں دادا‘ مجھے تو چوزہ ہی چاہئے۔ مشتاق نے ضد کی۔ اس کے ساتھ ہی ”مجھے بھی.....مجھے بھی“ کا کورس بلند ہوا۔ اس میں آمنہ کی مہین سی آواز بھی شامل تھی۔

”تمہیں بولتی گڑیا نہیں چاہئے۔“ انہوں نے آمنہ سے پوچھا۔ ”اور تمہیں روبوٹ اور تمہیں ریسنگ کار۔۔۔“

لیکن کوئی بچہ چوزوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ ”بھئی.....یہ تو تمہیں نہیں مل سکتے۔“ انہوں نے دل پکا کرکے بچوں سے کہا لیکن اتنا کہنے ہی میں ان کا دل بڑی شدت سے دکھا۔

”کیوں دادا؟“

”فلیٹ میں چوزے نہیں پلتے۔“

”دادا جی‘ آپ پالیں گے تو فلیٹ میں بھی پل جائیں گے۔“ آمنہ نے معصومیت سے کہا۔

انہیں اس پر پیار آ گیا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ انہوں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم لوگوں کے ابوؤں کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔“

”لیکن دادا‘ آپ تو ابو کے بھی ابو ہیں۔“ آفاق نے کہا۔

”وہ تو ہوں لیکن بیٹا‘ یہ چوزے ہم نہیں لے سکتے۔“ انہوں نے لہجے میں قطعیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو نہیں آسکی مگر لہجے میں درشتی ضرور آ گئی۔

سب سے پہلے آمنہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ پھر تینوں لڑکوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مرزا کو سچ مچ اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بچوں کو بہلانے کی ترکیب سوچنے لگے۔ ”دیکھو‘ جب کوئی جانور پالتے ہیں تو وہ ہماری ذمہ داری ہوتا ہے۔ اس کا بہت خیال رکھنا ہوتا ہے۔“

”ہم بہت خیال رکھیں گے ان کا۔“

"مگر انہیں رکھیں گے کہاں؟"

"گھر میں اور کہاں۔" اشفاق بولا۔

"وہ تو ہمارا تمہارا گھر ہے۔ ان کا بھی گھر ہونا چاہیے۔"

"بڑی اماں کے طوطے کا پنجرہ خالی پڑا ہوا ہے۔ وہ انہیں دے دیں گے۔" آفاق نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔

"اور یہ بڑے نازک ہوتے ہیں۔" مرزا نے ایک اور کمزور سا اعتراض کیا۔

"ہم ان کا خیال رکھیں گے۔"

بچوں کے آنسو بہنے سے پہلے خشک ہو گئے تھے اور مرزا اب ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔ "کتنے کا ایک دے رہی ہو مائی؟"

"پانچ روپے کا بابو جی۔"

"اور ہم لے کر کیسے جائیں گے انہیں؟"

"تھیلی میں ڈال کر دوں گی۔" عورت نے شاپر کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے' چار دے دو۔" الگ الگ رنگ کے۔

مگر رنگ وہاں صرف تین تھے......لال' زرد اور سبز۔ "یہ تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔" مرزا بڑبڑائے۔ "یہ لوگ تو لڑتے ہی رہیں گے۔"

"نہیں دادا ہم نہیں لڑیں گے۔"

تینوں لڑکوں نے ایک ایک رنگ منتخب کر لیا۔ آمنہ نے لال پسند کیا۔ یوں لال چوزے دو ہو گئے۔ "گھر چل کر آمنہ والے پر مارکر سے سیاہ نشان بنا دیں گے تاکہ پہچان رہے۔" مرزا صاحب نے کہا۔

چوزے خریدنے سے پہلے مرزا صاحب کا دل بوجھل سا تھا مگر چوزے خریدنے کے بعد وہ ہلکے پھلکے ہو گئے۔ بچے جو اتنے خوش تھے۔ اب جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ انہوں نے سوچا۔ چوزوں کے لیے اپنی ذاتی ناپسندیدگی کو وہ بھول ہی گئے تھے۔

گھر پہنچ کر ملا جلا ردعمل سامنے آیا۔ ثمینہ نے چوزے دیکھتے ہی کہا۔ "یہ کیا اٹھا لائے تم لوگ؟"

"یہ چوزے ہیں خالہ۔" ننھی آمنہ نے بے حد عالمانہ شان سے کہا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔" ثمینہ نے بھنا کر کہا۔ "مگر یہ کیوں لے آئے تم لوگ؟"

"انہیں پال پوس کر بڑا کریں گے امی۔" آفاق نے پردادی کی زبان بولی۔

"اور بڑے ہو کر ان میں سے کچھ انڈے دیں گے اور کچھ بانگ دیں گے۔" اشفاق نے اعلان کیا۔

"پورے فلیٹ میں گندگی کرتے پھریں گے۔ ثمینہ نے کہا۔ پھر وہ مرزا صاحب کی طرف مڑی۔ "یہ آپ نے کیا کیا ابو؟"

مرزا صاحب بوکھلا گئے۔ "میں نے کیا کیا؟" بیٹے ہوتے تو انہیں وہ ڈانٹ دیتے مگر یہ بہو تھی۔ انہوں نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "میں تو منع کر رہا تھا مگر یہ لوگ پیچھے پڑ گئے۔ سختی سے منع کیا تو رونے لگے چاروں۔ میں کیا کرتا؟"

"ایک ایک تھپڑ لگا دیتے چاروں کو۔"

"اب یہ تو میں نہیں کر سکتا۔"

اتنے میں روبینہ کچن میں سے نکل آئی۔ وہ چوزوں کو دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔ "اللہ......کتنے چھوٹے......کتنے پیارے ہیں۔" اس نے ایک چوزے کو اٹھا کر رخسار سے لگا لیا۔

"بڑے ہو کر بہت مکروہ نکلیں گے۔" ثمینہ نے جل کر کہا۔

"دیکھا جائے گا۔"

"اور یہ جو گند کرتے پھریں گے' وہ کون صاف کرے گا؟" ثمینہ نے مسئلہ اٹھایا۔

"میں صاف کروں گی۔" روبینہ نے مسئلہ حل کر دیا۔

مرزا نے سکون کی سانس لی۔ بہوؤں کی رائے منقسم ہو گئی تھی۔ یہ اچھی علامت تھی۔

نجمہ بیگم بھی چوزوں کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ "انہیں دیکھ کر اللہ کی شان سمجھ میں آتی ہے۔" وہ بولیں۔ "اتنے ننھے سے اور اتنے تیز و طرار۔ کوئی نوزائیدہ مخلوق اتنی پھرتیلی نہیں ہوتی اور ہیں کتنے خوبصورت۔"

ادھر اماں بھی باہر نکل آئیں۔ "ارے منے' یہ بہت اچھا کیا۔ گھر میں جانور ہونے چاہئیں۔ جان اور مال کا صدقہ ہوتے ہیں یہ۔"

"میں نہیں لایا اماں۔" مرزا نے جلدی سے کہا۔ "بچوں نے زبردستی کی ہے۔"

انہوں نے ثمینہ کو کن انکھیوں سے دیکھا جو مسکرا رہی تھی۔

"جس نے بھی کیا' اچھا کیا۔" اماں بولیں۔

مرزا مطمئن ہو گئے اور یہ صدقے والی بات اماں ہمیشہ کہتی تھیں اور ہر بار وہ اس کی وضاحت طلب کرتے تھے مگر آج انہوں نے وضاحت بھی نہیں چاہی۔ اتنا کافی تھا کہ اماں چوزوں کی حامی تھیں۔

چوزوں کو خاموشی سے طوطے کے پنجرے میں بند کر دیا گیا۔

اگلی صبح ہنگامے کی صبح تھی!

اس روز بچے سب سے پہلے جاگے۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ پہلے کون جاگا۔ بہرحال کوئی ایک بچہ اٹھا اور اس نے سارے بچوں کو جگا دیا۔ پنجرہ بڑی اماں کے کمرے میں تھا۔ چاروں اس کے پاس جمع ہو گئے۔ پنجرے پر گرم کمبل ڈال دیا گیا.....چوزوں کو سردی سے بچانے کے لیے۔

"کیا خیال ہے' یہ جاگ رہے ہوں گے؟" مشتاق نے کہا۔

"بالکل جاگ رہے ہوں گے۔" اشفاق بولا۔

"اتنے سویرے جاگ جاتے ہیں یہ؟" آمنہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تمام جانور اور درخت صبح سویرے جاگ اٹھتے ہیں اور اللہ کی حمد و تسبیح بھی کرتے ہیں۔" آفاق نے کہا۔ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔ "یہ بات میری مس نے بتائی ہے اور بڑی اماں بھی یہی کہتی ہیں۔"

"حمد و ثناء کی آواز تو نہیں آ رہی۔" اشفاق نے شک آمیز لہجے میں کہا۔

"دل ہی دل میں کر رہے ہوں گے.....دادا کی طرح۔" مشتاق بولا۔

"کمبل اٹھا کر دیکھیں۔" آمنہ نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

آفاق سب سے بڑا تھا۔ اس اعزاز پر اسی کا حق تھا۔ اس نے کمبل اٹھایا۔ کمبل اٹھاتے ہی پہلے پنجرہ' پھر کمرہ اور پھر پورا گھر چوزوں کی آوازوں سے بھر گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" آمنہ نے پوچھا۔

"شاید ناشتہ مانگ رہے ہیں۔" اشفاق نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن خالہ تو سو رہی ہیں۔"

"لگتا ہے' ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔" آفاق نے کہا۔ "لیکن کیا کریں؟"

انہوں نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چوزے نکلے اور تیزی سے دوڑ گئے۔ چاروں بچے ان کے ناشتے کی فکر میں کچن میں جا گھسے۔

اس روز بچوں کو تیار کرنے کی باری روبینہ کی تھی۔ الارم بجا۔ اس کی آنکھ کھلی اور اس نے الارم بند کر دیا۔ باتھ روم سے نکل کر وہ بچوں کے کمرے میں گئی تو گھبرا گئی۔ بچوں کے بستر خالی تھے۔ کوئی ایک بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ حالانکہ ہر روز وہ بڑی دشواری سے اٹھتے تھے۔

پھر اسے کچن کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ وہ دبے پاؤں کچن کی طرف بڑھی اور جھانک کر دیکھا۔ اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ چاروں بچے کچن میں موجود تھے۔ آمنہ کچن کے سنک کے پاس جھکی کھڑی تھی۔ اشفاق چھوٹے تسلے میں آٹا ڈالے اسے گوندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفاق اور مشتاق اس کے پاس کھڑے تھے۔ آفاق ہدایت کاری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ "ذرا زور سے مکی لگاؤ نا۔"

"لگا تو رہا ہوں بھائی۔" اشفاق نے بے چارگی سے کہا۔

"امی کو نہیں دیکھا کبھی۔ ان کی طرح گوندھنا۔"

کوشش کر رہا ہوں بھائی مگر پانی زیادہ پڑ گیا ہے۔ آٹا بہت پتلا ہو گیا ہے۔

"تو آٹا اور ڈال لو۔"

اسی وقت سنک کے پاس کھڑی آمنہ نے گھبرا کر کہا۔ "ارے.....ارے...یہ کیا؟"

اشفاق اور آٹا ملا رہا تھا۔ مشتاق اور آفاق اسے چھوڑ کر سنک کی طرف لپکے۔

"کیا ہوا؟" آفاق نے آمنہ سے پوچھا۔

چھی چھی......کتنے گندے ہیں یہ۔ آمنہ نے گھن کھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو سنک کی گندگی میں گھس رہے تھے۔ اب کیڑے مکوڑے کھا رہے ہیں۔"

مشتاق اور آفاق نے جھک کر دیکھا اور وہ بھی چھی چھی کرنے لگے۔

"واقعی.....بہت گندے ہیں۔" مشتاق نے کہا۔

"ان کی امی نہیں ہیں ناں۔ اس لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔" آفاق بولا۔

"ان کی امی ہوتیں تو انہیں روکتیں۔"

"تو ان کی امی بھی ہیں؟" آمنہ نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

"اس کے بغیر کوئی ہوتا ہی نہیں۔ امیاں تمام مخلوق کی ہوتی ہیں۔" اشفاق نے آٹا گوندھتے گوندھتے کہا۔

"ان کی امی کون ہیں؟" آمنہ نے پوچھا۔

"مرغی صاحبہ۔ یہ مرغی صاحبہ کی اولاد ہیں۔" اشفاق نے پھر جواب دیا۔

"مرغی صاحبہ کیا' مرغی کہو سیدھے سیدھے۔" آفاق نے اسے ڈانٹا۔

"نہیں بھئی' مس کہتی ہیں کہ ماں کسی کی بھی ہو' اس کی عزت کرنی چاہئے۔" مشتاق بولا۔

آفاق لاجواب ہو گیا۔ "ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میری مس بھی یہی کہتی ہیں۔"

مگر ان باتوں سے آمنہ کی فکرمندی دور نہیں ہو سکی۔ "دادا کو ان کی امی کو بھی لانا چاہیے تھا۔" وہ بولی۔

"انہیں کہاں سے لاتے' وہ تو کسی کے پیٹ میں ہوں گی۔" اشفاق نے آٹے کی مشقت سے دھیان ہٹاتے ہوئے کہا۔

آمنہ ٹھیک طرح سے حیران بھی نہ ہو پائی تھی کہ آفاق نے اعتراض کر دیا۔ "یہ تو تم غلط کہہ رہے ہو۔"

"کیسے؟ مرغی صاحبہ ذبح ہو کر کسی کے پیٹ میں ہی گئی ہوں گی۔" اشفاق نے اسے چیلنج کر دیا۔

"تم نے سائنس نہیں پڑھی ہے ڈھنگ سے۔" آفاق نے اکڑ کر کہا۔ "میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ پیٹ میں کوئی چیز بس تھوڑی دیر رکتی ہے اور اتنی دیر میں روپ تبدیل کر لیتی ہے۔ ایک چیز ہوتی ہے......CYCLE OF LIFE فرض کر لو۔ ہم نے مرغی کھائی۔ معدے نے اس کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ خون بن گیا' دوسرا پوٹی۔ پوٹی مٹی میں جا کر ملی تو کھاد بن گئی۔ وہاں بیج پڑا اور بارش ہوئی تو اناج اگا' گھاس

اگی۔ گھاس جانوروں نے کھایا۔ جانوروں کو ہم نے کھایا۔ پھر معدے نے کام کیا۔ بس یہی چکر چلتا رہتا ہے۔ یہ زندگی کا چکر کہلاتا ہے۔"

اشفاق بھائی کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "مجھے یقین نہیں آتا بھائی۔"

"میری طرح کلاس فائیو میں پہنچو گے اور سائنس پڑھو گے تو یقین آ جائے گا۔"

آمنہ اس گفتگو سے سخت بے مزہ ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ آفاق نے مزید کہا۔ "اب تک ان چوزوں کی امی' مرغی صاحبہ ہو سکتا ہے کھاد بن چکی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ نباتات میں تبدیل ہو چکی ہوں۔"

مشتاق بہت دیر سے سوچ رہا تھا.....غور و فکر کر رہا تھا' وہ بولا۔ آفی' وہ عورت کہہ رہی تھی کہ یہ چوزے تین دن کے ہیں۔

"ہاں۔ اتنے ہی دن کے ہوں گے۔ وہ جھوٹ تو نہیں کہہ رہی ہو گی۔"

"تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مرغی صاحبہ کھاد بن چکی ہوں اور یہ چوزے ابھی تین دن پہلے انڈے سے نکلے ہوں۔" مشتاق نے اعتراض کیا؟

آفاق نے جواب دینے سے پہلے صرف ایک لمحے سوچا۔ "بھائی' یہ سسٹم مختلف ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ انڈے پر مرغی صاحبہ ہی بیٹھی ہوں تو چوزہ نکلے گا۔ کوئی بھی بیٹھ جائے۔"

"مثلاً؟"

بڑی "اماں بتاتی ہیں کہ وہ مرغی کا انڈہ بطخ کے نیچے رکھ دیتی تھیں۔" آفاق نے حوالہ دیا۔

"تو پھر بچہ بھی بطخ کا نکلتا ہوگا؟" اشفاق نے پھر ٹانگ اڑائی۔

"انڈہ مرغی کا ہوگا تو چوزہ ہی نکلے گا۔ انڈے پر کوئی بھی بیٹھے۔" کتابی سائنس سے بھرے آفاق نے بھنا کر کہا۔

"کوئی بھی بیٹھے؟" اشفاق نے چیلنج کیا۔

"ہاں' چاہے تم بیٹھ جاؤ۔ مرغی کے انڈے میں سے چوزہ ہی نکلے گا۔"

"میں ضرور بیٹھ کر دیکھوں گا۔" اشفاق نے بے حد عزم سے کہا۔ پھر ذرا کمزور لہجے میں بولا۔ "انڈہ ٹوٹ تو نہیں جائے گا میرے بیٹھنے سے؟"

"تجربہ کرکے دیکھ لو۔ بس یہ ہے کہ اس میں سے انسان کا بچہ نہیں نکلے گا.....تم سے ملتا جلتا۔"

اس پر اشفاق مارے خفت کے گنگ ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اب آمنہ کو اپنی بات کہنے کا موقع ملا۔ "بھائی ان کے پاپا تو ہوں گے۔"

"کیا پتا' وہ مرغی صاحبہ سے پہلے ہی کھاد بن چکے ہوں۔" آفاق نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر انہیں تمیز کون سکھائے گا؟" آمنہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔ "دیکھیں تو' کتنی گندگی کر رہے ہیں۔ پاؤں بھی گندے ہو گئے ہیں ان کے۔"

"فکر نہ کرو' ہم انہیں تمیز سکھائیں گے۔" آفاق نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ "جیسے امی اور پاپا ہمیں سکھاتے ہیں۔ اب یہ ہمارے بچے ہیں۔"

اب تک روبینہ بڑی مشکل سے ہنسی روکے ہوئے تھی مگر اب برداشت جواب دے گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بچے بری طرح چونکے مگر اس دوران میں روبینہ کی نظر کلاک پر پڑی اور وہ گھبرا گئی۔ بچوں کی باتوں میں اس نے اتنا وقت ضائع کر دیا تھا۔ کہیں اسکول کی چھٹی نہ ہو جائے۔ وہ جلدی سے کچن میں جا گھسی۔ "تم لوگ یہاں گھسے کیا کر رہے ہو؟" اس نے انہیں ڈانٹا۔ "نہ دانت برش کیے' نہ منہ دھویا۔ اسکول نہیں جانا ہے کیا؟"

"جانا ہے۔" چاروں نے بیک آواز کہا۔

"بس تو سیدھے باتھ روم میں جاؤ۔ میں ناشتہ لگاتی ہوں۔"

"لیکن بچے بھوکے ہیں۔"

"انہیں میں کھلا دوں گی' تم جاؤ۔"

"لیکن امی' یہ لوگ گندگی کر رہے ہیں۔" مشتاق نے کہا۔

"اور دادا مرغی صاحبہ کو بھی نہیں لائے اور ان کے پاپا کو بھی نہیں لائے۔ اب انہیں تمیز کون سکھائے گا۔" آمنہ نے مسئلہ اٹھایا۔

"تم لوگ جاؤ ورنہ میں یہ چوزے کسی کو دے دوں گی۔" روبینہ نے دھمکی دی اور چاروں بچے کچن سے نکل گئے۔

○

مرزا صاحب نماز کے بعد کافی دیر تک وظائف پڑھتے تھے۔ وہ عبادت کے کمرے سے نکلے تو بچے ناشتہ کر رہے ہوتے تھے۔ اس روز وہ کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آئے تو انہیں سکتہ سا ہو گیا۔ وہ منظر تھا ہی کچھ ایسا۔

دسترخوان بچھا تھا۔ چاروں بچوں کے سامنے ہاف فرائی انڈے رکھے تھے۔ ٹرے میں ٹوسٹ تھے مگر ہر بچہ کھانے کے بجائے ایک ایک چوزے کو لیے اپنے حصے کا انڈہ کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چوزے بے رغبتی سے ایک چونچ مارتے اور پھر ادھر ادھر چونچیں مارتے پھرتے۔ وہ پورے دسترخوان پر دندنا رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" مرزا صاحب نے قدرے غصے سے پوچھا۔

"یہ ناشتہ کر ہی نہیں رہے ہیں دادا جان۔" آفاق نے شکایت کی۔

"تو بے وقوفو' تم انہیں کھلا کیا رہے ہو اور یہ کیا گندگی ہے۔ اسی لئے تو میں جانوروں کے خلاف ہوں۔" مرزا صاحب دہاڑے۔

مرزا صاحب کی وہ دھاڑ اس قدر خلاف معمول تھی کہ گھر میں ہنگامی صورتحال پیدا ہو گئی۔ مصلے پر بیٹھی نجمہ بیگم نے جلدی سے مصلے کا کونہ الٹا اور ٹی وی لاؤنج کی طرف لپکیں۔ اپنے اپنے بیڈ روم میں سوئے ہوئے آفتاب اور ظفر گھبرا کر اٹھ بیٹھے لیکن باہر نکلنے کی انہیں ہمت نہیں ہوئی۔ ثمینہ بھی جاگ گئی لیکن اس نے آنکھیں بند کرکے لیٹے رہنے میں ہی عافیت جانی۔ اماں کی بھی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے لیٹے لیٹے چیخ کر کہا۔ "کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے صبح سویرے۔ میری نیند بھی خراب کر دی تو نے۔ ابھی پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے آنکھ لگے۔"

مگر اس چیخ کا سب سے شدید ردعمل بچوں پر ہوا۔ تینوں لڑکے سہم گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں تکنے لگے جبکہ آمنہ باقاعدہ رونے لگی۔

نجمہ بیگم دروازے میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے آگے جانا مناسب نہ سمجھا۔

دراصل مرزا شاک کی حالت میں بے اختیار دہاڑے تھے۔ شاک کا سبب یہ تھا

کہ وہ محض بچوں کی محبت میں چوزے لے آئے تھے ورنہ ان کے لئے ناپسندیدگی ان کے دل میں اب بھی ویسی ہی تھی اور اس وقت انہیں یہ یاد بھی نہیں رہا تھا کہ چوزے گھر میں ہیں۔ وہ تو بس انہیں لا کر بھول گئے تھے۔ اب وہ منظر دیکھا تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ چار عدد چوزے یہاں کیسے وندناتے پھر رہے ہیں اور پھر وہ گندگی.....وہ بھی بچوں کے کھانے میں!

بچوں کے ردعمل نے انہیں شاک سے نکالا۔ ان کی صورتیں دیکھ کر انہیں شرمندگی ہونے لگی۔ اپنا آپ برا لگنے لگا۔ ایسے پھول سے بچے اور ایسی سفاک ڈانٹ۔ پھر کان میں بڑی اماں کی پھٹکار ان کے دماغ نے رجسٹر کی۔ سب سے پہلے انہوں نے اماں کے کمرے کی طرف رخ کرتے ہوئے بلند آواز میں شرمندہ لہجے میں کہا۔

"سوری اماں' میں پاگل ہو گیا تھا۔ آپ سو جائیے۔"

"اب خاک نیند آئے گی۔ اب تو گیا پورا دن۔" اماں نے بھنا کر کہا۔

مگر مرزا نے سنا نہیں۔ وہ بچوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اس زیادتی کی تلافی کیسے کریں۔

دونوں لڑکوں نے اماں اور ابو کے یہ مکالمے بھی سنے اور سمجھ لیا کہ ابھی باہر نکلنے اور صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے حالات سازگار نہیں۔ مزید لیٹے رہنے میں ہی عافیت ہے۔

آمنہ نے روتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان شکایتی لہجے میں کہا۔ "دادا...... آپ نے..... آپ نے مجھے مارا۔"

مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ "میں نے مارا...... کب؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ انہیں شبہ ہونے لگا کہ شاید بے خبری اور اشتعال میں وہ ہاتھ بھی اٹھا چکے ہیں۔

"ابھی مارا..... آپ نے...... اتنے زور سے۔" آمنہ نے بے حد وثوق سے کہا۔

"نہیں تو۔ مجھے تو یاد نہیں۔ میں کیسے مار سکتا ہوں اپنی شہزادی کو؟" مرزا کھکھیائے۔

پیچھے دروازے میں کھڑی نجمہ بیگم نے کہا۔ "آپ کی ڈانٹ بھی ان کے لیے مار

کے برابر ہے۔"

مرزا نے پلٹ کر انہیں دیکھا' کھسیائے اور دوبارہ بچوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ بیٹھے اور انہوں نے آمنہ کو گود میں بھر لیا۔ "سوری بھئی۔ ویری سوری۔ اصل میں مجھے یاد نہیں رہا کہ بچوں کو کیسے سمجھایا جاتا ہے۔" وہ بولے۔ "اور میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم ان چوزوں کو خراب کر رہے ہو۔ تم انہیں ان کی نسل کا آدم خور بنا رہے ہو۔"

"کہانیوں والا آدم خور؟" روتی ہوئی آمنہ ایک دم چہکنے لگی۔

"کیسے دادا؟" آفاق نے پوچھا۔

"دیکھو بھئی۔ ابھی تین دن پہلے تو یہ بیچارے خود بھی انڈے تھے اور اب تم انہیں انڈہ کھلا رہے ہو' یہ کیسے کھائیں گے۔ ذرا سوچو تو' کوئی مرغی' مرغی کو کھاتی ہے کبھی؟ کوئی بھی جانور اپنے ہم جنس کو نہیں کھاتا.....سوائے بھیڑیئے' سانپ اور مچھلی کے۔"

تینوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر ہلانے لگے۔ "یہ تو ٹھیک ہے دادا جی!"

"دوسری بات یہ کہ یہ تمہاری پلیٹ میں چونچ ڈالیں گے تو جراثیم منتقل کریں گے۔ یہ خدانخواستہ تمہاری صحت کے لئے نقصان دہ ہے اور تمہارے ابوؤں نے یہ دیکھ لیا تو وہ چوزوں کو گھر میں ہی نہیں رہنے دیں گے۔"

چاروں بچے تشویش سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ "پھر کیا کریں دادا جان؟" مشتاق نے پوچھا۔

"میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اب تم لوگ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرو۔ اس میں سب کی بہتری ہے۔"

"چوزوں کی بھی؟" آفاق نے کہا۔

"ہاں' چوزوں کی بھی۔"

"تو ہم اسی وقت سے میز پر کھانا شروع کریں گے۔"

بچے اپنی پلیٹیں اٹھانے لگے تو مرزا صاحب نے انہیں روک دیا۔ "اب یہ جراثیم

سے بھرا ناشتہ نہ کرنا۔" پھر انہوں نے کچن کی طرف رخ کر کے روبینہ کو آواز دی۔

روبینہ یہ سب کچھ سنتی رہی تھی۔ اب صورتحال کچھ بہتر ہوئی تھی تو وہ خود بھی کچن سے نکلنے کا سوچ رہی تھی۔ اب اس نے سوچا کہ یہ اور اچھا ہوا کہ ابو نے خود ہی بلا لیا۔ وہ کچن سے باہر آئی۔ "جی ابو؟"

"بچوں کو اور انڈے تل کر دو.....اور ہاں' اب یہ میز پر بیٹھ کر کھایا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے ابو۔" روبینہ نے کہا اور برتن سمیٹنے لگی۔ پھر اچانک اس نے سر اٹھا کر مرزا صاحب کو دیکھا۔ "لیکن ابو.....ان کا اسکول؟"

مرزا صاحب نے کلاک کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "اب آج تو چھٹی ہی ہوگئی ان کی۔"

اس پر بچوں کے دانت نکل پڑے۔ وہ خوش ہو گئے۔ انہیں چوزوں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔

"لیکن آج کے بعد اسکول سے چھٹی ہوئی تو چوزے گھر میں نہیں رہیں گے۔" مرزا صاحب نے دھمکی دی۔

"بچے ڈائننگ روم میں چلے گئے۔"

"ابو.....آپ کا ناشتہ لاؤں؟" روبینہ نے پوچھا۔

"پہلے ان کے پیٹ بھرنے کا کچھ سامان کرو۔" مرزا صاحب نے چوزوں کی طرف اشارہ کیا۔ کب سے بھوکے ہیں؟

"ان کا تو ابھی کچھ ہو نہیں سکتا۔ دکان کھلے تو باجرہ منگواؤں۔"

"باجرہ تو ہوگا۔ گیلری میں چڑیوں کی ٹرے سے لے لو۔"

"وہاں بھی نہیں ہے ابو۔ کل ختم ہو گیا تھا۔ مجھے پرچے میں لکھنا یاد نہیں رہا۔"

"تو یہ اور کچھ نہیں کھاتے؟" مرزا صاحب نے حیرت سے کہا۔

"مجھے تو نہیں معلوم ابو۔ آپ کو پتہ ہوگا۔" روبینہ بولی۔

"مجھے کہاں معلوم ہے۔ میں نے کبھی ان چیزوں میں دلچسپی ہی نہیں لی۔" مرزا نے گہری سانس لے کر کہا۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

○

ظفر اور آفتاب کو جب اندازہ ہوا کہ معاملات ٹھنڈے ہو چکے ہیں تو انہوں نے اپنے اپنے باتھ روم کا رخ کیا۔ تقریباً ایک ہی وقت میں وہ لاؤنج میں نکلے۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ دونوں کی ایک دوسرے پر نظر پڑی تو دونوں ہی کھسیا گئے۔ "آج گھر میں بڑی خاموشی ہے۔" ظفر نے کہا۔

"ہاں۔ طوفان کے بعد کی خاموشی۔" آفتاب بولا۔

"بچے تو شاید اسکول چلے گئے۔"

"آج دماغ بھی کچھ زمین پر آیا ہوگا۔ ابو کا غصہ تو انہوں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"ویسا تو آج بھی نہیں دیکھا ہوگا' جیسا ہم نے دیکھا ہے۔" ظفر نے کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ "روبی' ناشتہ لگا دو۔ بھائی بھی تیار ہیں۔"

"ابھی لگاتی ہوں۔"

ادھر لاؤنج میں کھڑے آفتاب کو بچوں کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دیں۔ پہلے تو اسے ایسا لگا کہ اس کے کان بج رہے ہیں۔ پھر احساس ہوا کہ آوازیں حقیقی ہیں اور ڈائننگ روم سے آرہی ہیں۔ وہ اس طرف چلا گیا۔ بچوں کو ناشتہ کرتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ارے.....تم لوگ اسکول نہیں گئے؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"دیر ہو گئی تھی۔ دادا نے کہا' آج چھٹی کر لو۔" اشفاق نے کہا۔

آفتاب بچوں کے سامنے ابا کی پالیسیوں پر تنقید اور احتجاج نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔

جس وقت ظفر روبینہ سے بات کر رہا تھا' چوزے سنک کے نیچے گھسے ہوئے تھے۔

ظفر واپس ہوا تو وہ چاروں اس کے پیچھے لپکے۔ باہر پہنچتے پہنچتے وہ اس سے آگے ہو گئے۔ ڈائننگ روم سے واپس آتے ہوئے آفتاب نے ظفر کو دیکھتے ہی کہا۔ "تمہیں پتا ہے بچے......" وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔ چوزوں کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "ارے ظفر' یہ کیا؟ تم چوزے لے آئے گھر میں؟"

ظفر خود حیران و پریشان کھڑا تھا۔ "میں کیوں لانے لگا بھائی؟ کیا میں جانتا نہیں ہوں؟" اس نے جلدی سے کہا۔

"تو ابو اس بات پر گرج رہے تھے۔" آفتاب نے پرخیال لہجے میں کہا۔ پھر وہ خود بھی زور سے دہاڑا۔ "کون احمق یہ چوزے لے آیا ہے؟"

یہ سن کر روبینہ جلدی سے کچن سے نکلی۔ "کیوں چیخ رہے ہیں بھائی۔" بچے لائے ہیں۔ اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

اس کے لہجے سے دونوں بھائیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ بچوں کی ضد پر چوزے اس نے دلائے ہیں۔ آفتاب اس کا لحاظ کرتا تھا' لہٰذا چپ رہا لیکن ظفر تو شوہر تھا۔ "یہ تم نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ فوراً گھر سے پھنکواؤ انہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا اور پلیز۔ آپ آہستہ بولیں۔" روبینہ نے دھیرے سے کہا۔

"کیوں آہستہ بولوں؟" ظفر کی آواز اور بلند ہو گئی۔ "اور یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟"

یہ آوازیں سن کر مرزا صاحب اپنے کمرے سے نکل آئے۔ "کیوں چلا رہے ہو تم دونوں؟" انہوں نے دونوں لڑکوں سے کہا۔ "جانتے بھی ہو کہ گھر میں دھیمی آواز میں بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔"

"گھر میں قیامت آجائے اور میں چلاؤں بھی نہیں۔" ظفر نے لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا......کیا قیامت آگئی؟" مرزا صاحب نے دریافت کیا۔

"یہ دیکھ رہے ہیں آپ!" آفتاب نے چوزوں کی طرف اشارہ کیا۔ "کوئی احمق یہ چوزے لے آیا ہے اور اب یہ اس گھر میں پلیں گے۔"

مرزا صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "یہ تو میں لایا ہوں۔"

"آپ لائے ہیں! چوزے لائے ہیں..... آپ؟" آفتاب بوکھلا گیا۔

"ہاں' ہاں' میں ہی لایا ہوں۔ مگر تم چلا کیوں رہے تھے؟"

"میں.....میں نہیں.....ہم چلا رہے تھے۔" آفتاب نے ظفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور آپ کی خاطر چلا رہے تھے۔"

"میری خاطر؟" مرزا صاحب نے حیرت سے کہا۔

"جی۔ ہم سمجھے تھے کہ آپ چوزوں کو گھر میں دیکھ کر خفا ہوں گے' اس لیے۔"

"میں نہیں ہوا۔ اب چلانا نہیں۔"

"جی بہتر۔ اور وہ.....بچے.....وہ اسکول بھی نہیں گئے۔" ظفر بولا۔

"میں نے ہی منع کر دیا تھا۔" مرزا صاحب نے کہا اور دوبارہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ذرا دیر بعد روبینہ نے آکر ان سے ناشتے کو پوچھا۔ انہوں نے اس بار بھی منع کر دیا۔ دراصل وہ چوزوں کی بھوک کی طرف سے فکرمند تھے۔ "کہیں بھوک سے مر ہی نہ جائیں۔" وہ بڑبڑائے۔ اس لیے جانور پالنے کے خلاف ہوں میں..... بیچارے' بے زبان.....بڑی ذمہ داری ہوتی ہے ان کی۔ مر گئے تو اللہ کو جواب دینا ہوگا۔

خاصی دیر وہ سوچتے رہے مگر کچھ سجھائی نہیں دیا کہ چوزوں کو کیا کھلائیں۔ پھر انہیں خیال آگیا کہ اماں یقیناً بتا سکتی ہیں۔ وہ نکلے اور اماں کی طرف چل دیئے مگر وہ دروازے پر ہی رک گئے۔ اندر عدالت لگی تھی۔ ظفر اور آفتاب ان کے خلاف کیس پیش کر رہے تھے مگر آوازیں دھیمی تھیں۔

"اب دیکھیں ناں دادی' چوزے لے آئے اٹھا کر۔" آفتاب کہہ رہا تھا۔

"حالانکہ ہمیں کبھی اس کی اجازت نہیں دی۔" ظفر بولا۔

"اب فلیٹ میں چوزے پلیں گے۔ مرغیاں شور مچا مچا کر انڈے دیں گی۔"

"اور گھر میں رات کے دو بجے مرغے بانگ دیا کریں گے۔"

"اور بچوں کی چھٹی بھی کرا دی اسکول سے۔"

"ہمیں تو طوفانی بارش میں بھی گھر سے نکال دیا کرتے تھے۔"

"بچوں کو ڈانٹنے پر پابندی ہے۔ ہم بچے تھے تو تربیت کی بات کرتے تھے۔"

"اب کہتے ہیں' بچوں کو ڈانٹو گے تو خود اعتمادی نہیں رہے گی ان میں۔"

"ابو بچوں کو بگاڑ رہے ہیں دادی۔"

ان مکالموں کے دوران میں اماں کے چھالیا کاٹنے والے سروتے کی آوازیں پس منظر موسیقی کا کام کر رہی تھیں۔ مرزا سمجھ سکتے تھے کہ اماں اس وقت صبح کے پہلے پان سے لذت سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک جوابی مکالمہ ایک بھی نہیں سنائی دیا تھا۔

اور جو کچھ لڑکے کہہ رہے تھے' وہ سب انہیں یاد تھا۔ ساری باتیں یاد تھیں انہیں۔ لڑکے ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ہاں' یہ ضرور تھا کہ کچھ باتیں وہ بھول گئے تھے۔ شاید انہیں یاد ہی نہیں رہی تھیں مگر انہیں یاد تھیں۔

وہ کھنکارتے ہوئے اماں کے کمرے میں داخل ہوئے۔ لڑکے ایک دم ہی چپ ہو گئے۔ اماں نے پان کلے میں ایک طرف دباتے ہوئے کہا۔ "آؤ منے' بیٹھو..... آج اتنی صبح کیسے آگئے اور دہاڑ کیوں رہے تھے سویرے سویرے؟"

"غلطی ہو گئی اماں۔ عقل خبط ہو گئی تھی۔" مرزا نے سعادت مندی سے کہا۔

"اور میں یہ پوچھنے کے لیے آیا تھا کہ چوزے بھوکے ہیں۔ باجرہ ہے نہیں' انہیں کیا کھلایا جائے؟"

دونوں لڑکے کرسیوں سے اٹھنے لگے۔ ان کے چہروں پر حیرت تھی۔ یہ کیا الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ ابو اور چوزوں میں اتنی دلچسپی!

"تم کہاں چلے' بیٹھو کچھ دیر۔" اماں نے ان سے کہا۔

"وہ ناشتہ کرنا ہے دادی!" آفتاب بولا۔

"اور دفتر بھی جانا ہے۔" ظفر نے کہا۔

"چلے جانا۔ تھوڑی دیر تو بیٹھو میرے پاس۔"

"ہاں بیٹھو ناں۔ کب سے تبادلہ خیال نہیں ہوا ہے۔" مرزا صاحب نے کہا۔ "آج کچھ ہو جائے۔"

"تبادلہ خیال تو دوطرفہ ہوتا ہے ابو۔ ہم تو آپ سے سیکھتے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جیسے میں نے ساری عمر اماں سے سیکھا۔ سب کچھ اماں سے ہی سیکھا ہے میں نے۔" مرزا صاحب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "پھر بھی بیٹھو کچھ دیر۔"

"جی ابو!" دونوں نے کہا اور یوں بیٹھ گئے جیسے باندھ کر بٹھائے گئے ہوں۔

"میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اماں!"

"تو کرو منے' روکتا کون ہے۔" اماں بولیں۔

"کچھ اعتراف کرنے ہیں۔" مرزا نے گہری سانس لے کر کہا۔

"کرو۔ اچھا آدمی زندگی کی آخری سانس تک اعتراف کرتا ہے غلطیوں کا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہر لمحے غلطیوں سے بچنے کی' اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر وقتاً" فوقتاً" اسے احساس ہوتا رہتا ہے کہ اب بھی وہ غلطی پر تھا۔ اب بھئی انسان تو خطا کا پتلا ہوتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں۔ یہی بات ہے۔" مرزا کی آہ اور سرد ہو گئی۔ "ماں باپ کی محبت بہت بڑی ہوتی ہے۔ جب میں باپ بنا تو میں نے سوچا جن چیزوں سے محروم رہا ہوں' ان سے میرے بیٹے محروم نہ ہوں۔ جو کمی اور خامی مجھ میں رہ گئی ہے' میرے بیٹے ان سے پاک ہوں۔ میں ان کی بہت اچھی تربیت کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی انہیں بدتمیز کہے یا سمجھے۔ چنانچہ میں نے اپنی توجہ کا رخ ان کی طرف کر دیا۔" مرزا نے بیٹوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں بات بات پر انہیں ٹوکتا۔ اچھی باتوں کی تلقین کرتا۔ اس وقت میں یہ سمجھتا ہی نہیں تھا کہ بچے ہیں' بدتمیزی بھی کریں گے اور شرارت بھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ اسکول سے ایک دن چھٹی کر لیں گے تو جاہل رہ جائیں گے۔ اس لیے طوفانی بارش میں بھی انہیں اسکول بھیج دیتا۔ میں انہیں ضد سے روکتا کہ کہیں ضدی نہ ہو جائیں۔ یہ سوچ کر کہ ماں باپ سے ضدیں پوری کرانے والے آگے جا کر زندگی سے' اللہ میاں سے ضد نہ کریں اور ان دنوں میں سمجھتا تھا کہ میں راستی پر ہوں۔

"تو نہیں تھے کیا؟" اماں نے پوچھا۔

"جی' میں یہی اعتراف کر رہا ہوں۔" مرزا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "اور آپ

اس وقت تک یہ بات سمجھ گئی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے آپ سے شکایت ہونے لگی۔ یہ ضد کرتے، میں منع کرتا اور آپ چپکے سے ان کی ضد پوری کر دیتیں۔ کبھی ان کی خاطر مجھے ڈانٹ جھڑک بھی دیتیں۔ اس پر مجھے غصہ بھی آتا مگر آپ کا ادب کرتا تھا۔ اس لیے کچھ کہنے کا سوال ہی نہیں تھا لیکن میں اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ زیادہ بھر جاتا تو نجمہ سے شکایت کرتا کہ اماں بچوں کو بگاڑ رہی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر میں انہیں بگاڑ رہی تھی......کیسے؟"

"ایک دن یہ اسکول جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ آپ کے کمرے میں جا کر چھپ گئے۔"

ظفر اور آفتاب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آفتاب نے مرزا صاحب سے پوچھا۔

"آپ کو معلوم تھا ابو؟"

"ماں باپ کو سب معلوم ہوتا ہے۔"

"تو پھر......؟" ظفر نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"اماں میری ماں تھیں۔ ان کے مقابلے میں، میں اف نہیں کر سکتا تھا۔"

"تو اس سے بچے بگڑ گئے کیا؟" اماں نے تنک کر کہا۔ جاہل رہ گئے کیا؟

"یہی تو خوشی کی بات ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور میں نے سیکھ لیا کہ ایک دن کی چھٹی سے بچوں کی تعلیم ختم نہیں ہوتی۔" مرزا نے گہری سانس لی۔ "اور اماں، میں انہیں ڈانٹتا تھا تو آپ مجھے ڈانٹ دیتی تھیں۔ کبھی مارنے کا ارادہ کرتا تھا تو انہیں دامن میں چھپا لیتی تھیں۔ ایسے میں، میں سوچتا کہ آپ ان کی تربیت کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ آپ ان کی ضد ہر صورت میں پوری کرتی تھیں۔ میں گھر میں جانور پالنے کے خلاف تھا۔ آپ نے ان کا شوق پورا کرنے کے لیے کتا تک پال لیا۔ حالانکہ میں بچپن سے آپ سے سنتا آیا تھا کہ جس گھر میں کتا پلا ہو، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ ان کے شوق کی خاطر آپ نے گھر کو مرغی خانہ بنا دیا۔"

اماں نے غور سے دونوں پوتوں کو دیکھا۔ وہ مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اماں سے انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں بات کی اور اثبات میں سر ہلا

دیئے۔

"تو منے، اب تو چوزے لے آیا اور وہ بھی فلیٹ میں۔ اب وہ تیرے اصول کہاں گئے؟"

مرزا نے چند لمحے سوچا، پھر بولے۔ "اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے یہ بتائیں، یہ اعتراض ان دونوں نے کیا ہے؟"

"نہیں ابو۔" ظفر اور آفتاب نے جلدی سے کہا۔ "آپ کی بات پر ہم اعتراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

مرزا نے اماں کی طرف دیکھا۔ وہ تائید میں سر ہلا رہی تھیں۔

"تو آپ کو تو اعتراض نہیں تھا۔" مرزا نے اماں سے کہا۔

"مجھے اب بھی نہیں ہے۔ میں نے یہ سب پوتوں کی خاطر قبول کیا تو ان کی اولاد کے لیے نہیں کروں گی۔ میں تو صرف یاد دلا رہی تھی کہ تم ان چیزوں کے خلاف تھے۔"

"اور میں یہ اعتراف کرنے آیا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔ میں نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔" مرزا نے کہا اور میں نے یہ بھی سمجھ لیا ہے کہ یہ سب نہ صرف فائدہ مند ہے بلکہ ضروری بھی ہے کہ گھر میں جانور خاص طور پر چوزے پالے جائیں۔

"وہ کیسے ابو؟" آفتاب نے پوچھا۔

"بھئی یہ بچوں کی تعلیم کا حصہ ہے۔ حیاتیات کا پریکٹیکل سمجھ لو اسے۔" مرزا مسکرائے۔ "اللہ نے حکم دیا ہے کہ زمین میں گھومو، پھرو۔ آدمی گھومے پھرے تو اللہ کی خلاقی اور صناعی دیکھے گا۔ عجائبات دیکھے گا۔ عبرت کا سامان بھی نظر آئے گا۔ خوف خدا پیدا ہوگا اور ایمان کو پختگی ملے گی۔ اب گھومنا پھرنا ممکن نہیں تو جانور پالو۔ اللہ کی قدرت دیکھو۔ غور کرو اور سمجھو۔ ان کے سسٹم کو دیکھو۔ ہے ناں سمجھ بڑھانے والی بات۔" مرزا اماں کی طرف مڑے۔ "تو میں یہ اعتراف کرنے آیا تھا کہ میں بڑی ناسمجھی کرتا رہا ہوں۔ اب مجھے سمجھ آ گئی ہے۔ آپ جو کچھ کرتی تھیں، ٹھیک کرتی تھیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے بچے بگڑے بھی نہیں اور تعلیم اور کاروبار میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ سعادت مند ایسے ہیں کہ مجھ سے کبھی اختلاف بھی نہیں

کرتے۔" مرزا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ "اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو' چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ خواہ اس میں ان کے لیے پریشانی ہی کیوں نہ ہو اور جیسے خود کبھی کبھی چھٹی کر لیتے تھے اسکول سے۔ ویسے ہی اپنے بچوں کے چھٹی کرنے پر برا نہیں مانتے۔"

اس دوران میں دونوں لڑکے بڑی تندہی سے اثبات میں سرہلاتے رہے تھے۔

"مجھے خوشی ہے کہ میرے اس اعتراف کے وقت یہ دونوں بھی موجود ہیں۔" مرزا نے کہا۔ "اس سے انہیں فائدہ ہوگا۔ جو بات میں اب دادا بننے کے اتنے عرصے بعد سمجھا ہوں' یہ ابھی سے سمجھ لیں گے اور اصلاح کر لیں گے اپنی۔ کیوں' ٹھیک ہے نا؟" وہ لڑکوں کی طرف مڑے۔

"جی ابو' ہم تو سمجھ بھی گئے۔" دونوں لڑکوں نے بیک آواز کہا۔ مرزا فاتحانہ انداز میں اٹھے۔ "میں چلتا ہوں اماں۔"

"منے! اصل بات تم بھول گئے۔" اماں نے انہیں ٹوکا۔ "بات ہو رہی تھی چوزوں کے کھانے کی۔ تم بہو سے کہو کہ مجھے تھوڑا سا آٹا لا کر دے۔ میں چوزوں کو کھلا دوں گی۔"

مرزا جانے لگے تو اماں بولیں۔ "اور منے' یاد رکھنا۔ چوزے پیروں سے لپٹ کر چلتے ہیں۔ چوزے گھر میں ہوں تو آدمی کو ہر قدم سنبھل کر اٹھانا چاہیے ورنہ یہ پاؤں کے نیچے آکر مرجاتے ہیں۔"

مرزا ایک دم الرٹ ہو گئے۔ انہوں نے نیچے دیکھا۔ چوزے واقعی ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ "ٹھیک ہے اماں۔ میں ٹھیک طریقے سے چلنا بھی سیکھ لوں گا۔" انہوں نے بے حد سعادت مندی سے کہا اور اس کے بعد وہ یوں چلے جیسے فرش پر بہت سارے انڈے بچھے ہوں او وہ انہیں ٹوٹنے سے بچا رہے ہوں۔

ان کے باہر نکلتے ہی دونوں لڑکے منہ دبا کر ہنسنے لگے۔ "دیکھا تم نے۔" اماں نے کہا۔ "کتنا سیدھا ہے میرا منا۔" پھر ان کے لہجے میں محبت بھری خفگی آگئی۔ "اور تم لترے' اسی کی شکایت لے کر آئے تھے۔"

"ارے نہیں دادی!" آفتاب بولا۔ "ہم تو صرف بتا رہے تھے' شکایت کیسی؟"

○

مرزا کو پہلی بار پتہ چلا کہ پالنے والی ذات بس اللہ کی ہے' وہی پروردگار ہے۔

یہ ان کی زندگی کی بہت اہم نالج تھی.....ایمان کو مستحکم کرنے والی۔ ویسے مسلمان تو پیدا ہی اہل ایمان کے گھر میں ہوتا ہے اور اسے گھٹی میں بھی ایمان ہی دیا جاتا ہے لیکن اللہ نے دنیا کو ایسا کارخانہ بنایا ہے جو بظاہر آزاد معلوم ہوتا ہے۔ جب تک کوئی گہرائی میں غور نہ کرے' سوچے نہیں' تب تک ہر چیز میں' ہر کام میں اللہ کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ سب کچھ اپنے ایک طے شدہ سسٹم کے تحت ہوتا ہے اور خودکار سا لگتا ہے اور ایسے میں ایمان منہ زبانی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ دل میں ہوتا ہے۔ روح کی گہرائی میں رہتا ہے۔ لاشعور میں رہتا ہے۔ عقل' شعور اور دماغ تک نہیں پہنچ پاتا۔

مرزا جب باپ بنے تو ہر وقت پریشان اور خوفزدہ رہنے لگے۔ بچے چلبلے تھے۔ انہیں خطرات کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے خوف و خطر کسی بھی چیز میں گھس جاتے تھے۔ کہیں بھی چڑھ جاتے تھے۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے کو تیار رہتے تھے۔ مرزا ہر وقت ہولتے رہتے تھے۔ "بچوں کا بہت خیال رکھا کریں آپ۔" وہ بیگم سے کہتے۔ "آپ بہت بے پروائی کرتی ہیں۔"

اب یہ نجمہ بیگم ہی جانتی تھیں کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔ چھوٹے بچے اور وہ بھی جڑواں جڑواں۔ کوئی کہاں تک نظر رکھ سکتا ہے۔

"تو پریشان نہ ہو منے۔" اماں مرزا کو سمجھاتیں۔ "بچوں کو کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔"

"کیسے پریشان نہ ہوں اماں۔" وہ ظفر بجلی کے ساکٹ میں انگلی ڈال رہا تھا۔

"تو کچھ ہوا تو نہیں ناں اسے۔"

"قسمت اچھی تھی۔ اگلی بار خدانخواستہ کچھ ہو بھی سکتا ہے۔"

"قسمت کی بات نہیں۔ اللہ حفاظت فرماتا ہے بچوں کی۔"

"کیسے؟" مرزا نے گستاخانہ انداز میں چیلنج کیا۔

"اماں دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگیں۔ وہ جس طرح چاہے' حفاظت

فرمائے۔ اس کے کام بندوں کی سمجھ میں آجائیں تو پھر وہ بندے کیسے رہیں۔" وہ بولیں، پھر انہوں نے کہا۔ "بچوں کی حفاظت پر فرشتے مامور ہوتے ہیں۔"

" ہر گھر میں تو فرشتے نہیں ہوتے اماں۔" مرزا نے حجت کی۔

"جس گھر میں بچے ہوں، وہاں فرشتے ضرور جاتے ہیں۔ خواہ وہ نافرمانوں اور محروموں کا گھر ہو۔"

"مرزا کے حلق سے بات نہیں اتری۔ اتر بھی نہیں سکتی تھی۔"

اگلی بار آفتاب نے چلتے ہوئے پیڈسٹل فین میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس وقت وہ دو سال کا تھا۔ اس کی انگلی پر ہلکی سی خراش آئی۔ تھوڑا سا خون نکلا...... اور بس مگر مرزا ہراساں ہو گئے۔ "بھئی بچے پالنا بڑا مشکل کام ہے۔" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"کفر مت بک منے!" اماں نے انہیں ڈانٹا۔ پھر انہوں نے انگلی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "وہ پروردگار عالم ہے۔ سب کا وہی پالنے والا ہے۔ وہ ہاتھ اٹھا لے تو کوئی بچہ بڑا نہیں ہو سکتا۔"

"مگر اماں، یہ بہت شریر اور چلبلے بچے ہیں۔"

"سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تو بھی ایسا ہی تھا۔ میں بھی بہت ڈرتی تھی مگر دیکھ، تو کتنا بڑا ہو گیا۔ اب تیرے اپنے بچے ہیں۔"

"نہیں اماں، میں ہرگز ایسا نہیں تھا۔" مرزا نے بے حد وثوق سے کہا۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔ اپنا وقت کسی کو یاد نہیں رہتا۔" اماں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "تجھے درختوں پر، دیواروں پر چڑھنے کا کتنا شوق تھا۔ فرشتے حفاظت پر مامور نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔"

"پھر وہی فرشتے!" مرزا جھنجلا گئے۔ "چھوڑیں اماں اس بات کو۔"

"اماں کو جلال آگیا۔ خوامخواہ بکتا رہتا ہے۔ ذرا اس پنکھے میں انگلی ڈال کر دکھا۔ صاف اڑ جائے گی انگلی۔"

مرزا نے ایک پل کو سوچا۔ "واقعی......انگلی تو کٹ جائے گی اور پھر دو سال کے بچے کی انگلی اور تیز چلتا ہوا پنکھا۔ وہ تو بچے کو لپیٹ میں لے کر، گھما کر پٹخ بھی سکتا تھا۔ واقعی.....کوئی طاقت تو ہے۔"

"اور بچے روز تخت سے گرتے ہیں اور گرنے کے بعد بھی سوتے رہتے ہیں۔ کبھی تو سوتے میں گرے تو پتہ چل جائے۔" اماں نے مزید لتاڑا۔

یہ بھی سچ تھا۔ بچے اتنے اوپر سے سر کے بل بھی گرے تھے۔ مرزا کو سوچ کر ہی خوف آنے لگا۔

"اللہ بخشے اماں کو، کہتی تھیں۔ بچہ گرتا ہے تو فرشتے اسے اٹھا کر آہستگی سے فرش پر رکھ دیتے ہیں ورنہ سر پھٹ جاتے بچوں کے۔"

"لیکن میں نے تو بچوں کو دھم سے گرتے دیکھا ہے۔ دھماکہ بھی ہوتا ہے۔"

"فرشتوں کی رفتار بہت ہوتی ہے۔" اماں نے عالمانہ انداز میں کہا۔

مرزا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر بحث کرنا مناسب نہیں تھا مگر ان کا خوف دور نہیں ہوا۔ وہ بچوں کی طرف سے ہمیشہ ڈرتے رہے۔ بچے خطرات سے گزرتے ہوئے بڑے ہو گئے۔ بعد میں بھی کیسے کیسے حادثوں سے وہ بچے کہ انہیں معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے لیکن نہ مرزا کو یقین آیا، نہ ان کا خوف دور ہوا۔

اور اب ان کی سمجھ میں آگیا کہ درحقیقت پالنے والا صرف اللہ ہے!

اور یہ بات انہیں چوزوں نے سمجھائی تھی۔ چنانچہ انہیں چوزوں سے محبت ہو گئی۔

مرزا کیونکہ چوزے پالنے کے خلاف تھے، لہٰذا انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ چوزے پالنا کتنا مشکل کام ہے۔ اب پوتوں کی محبت میں انہوں نے اس کی اجازت دی اور مطمئن ہو گئے مگر وہ ان میں دلچسپی لے رہے تھے، لہٰذا ان کا مشاہدہ بننے لگا۔ ساتھ میں اماں کا تجربہ بھی تھا۔

"فریزر میں گرمی جہاں سے نکلتی ہے، انہیں وہاں رکھو۔" اماں نے حکم دیا۔

"کیوں اماں؟"

"موسم کی سختی انہیں ختم کر دیتی ہے۔ خاص طور پر سردی۔ وہاں انہیں گرمی ملتی رہے گی۔ یہ چوزے پالنا بڑا مشکل کام ہے۔"

مرزا کو یقین نہیں آیا۔ "اتنا مشکل ہوتا تو دنیا میں مرغیوں کی اتنی کثرت نہ ہوتی۔"

اماں ہنسنے لگیں۔ "منے' تو تو اب بھی بچہ ہی ہے۔ مرغیاں پالنا اور بات ہے پگلے۔ مرغیوں کے ساتھ ہوں تو چوزے برفانی موسم میں بھی نہیں مرتے۔ ویسے چوزے پالو تو مشکل سے دس میں سے ایک بچتا ہے۔"

"کیوں اماں؟"

"مرغی اپنے پروں میں چھپا کر رکھتی ہے چوزوں کو۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"مرغی کے پروں میں جو گرمی ہوتی ہے' تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یوں پالنے میں وہ گرمی کسی طرح بھی فراہم نہیں کی جاسکتی۔"

مرزا چپ ہو گئے۔ ان کے پاس مرغی کے پروں کا ایک تکیہ تھا۔ اس وجہ سے انہیں پروں کی گرمی کا کچھ اندازہ تھا مگر اب مرزا کو اپنی جہالت کا اندازہ ہونے لگا اور وہ اسے دور کرنے میں لگ گئے۔ اماں تعلیم سے محروم تھیں لیکن ان کے پاس دانش موجود تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ ہر چیز کو غور سے دیکھتی اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں اور مرزا نے یہ کام کبھی نہیں کیا تھا۔

چنانچہ وہ چوزوں کو دیکھنے اور ان پر غور کرنے لگے۔

سب سے پہلے تو اللہ کی قدرت اور صناعی پر ان کا ایمان تازہ ہو گیا۔ وہ اتنی سی چیز انڈے کے برابر چوزے نک سک سے درست تھے۔ کیسے خوبصورت لگتے تھے۔ تناسب کیسا تھا ان میں۔ لگتا تھا' چابی سے چلنے والے کھلونے ہیں لیکن نہیں چابی سے چلنے والے کسی کھلونے کی اتنی تیز رفتار..... نہیں ہوتی۔ ان کی تیزی اور پھرتی ناقابل یقین ہی تھی اور خطرناک بھی۔ چوزے ان سے پندرہ گز پیچھے ہوتے۔ وہ ان کے ساتھ ہی حرکت میں آتے تھے مگر وہ ایک قدم بڑھتے تو چوزے پندرہ گز کا فاصلہ طے کرکے ان کے پاؤں کے عین نیچے ہوتے۔ ان کا انداز میزائل کا سا تھا۔ وہ ہر متحرک چیز پر جھپٹتے اور اس رفتار سے جھپٹتے کہ دیکھنے کے باوجود یقین نہ آتا۔ مرزا سوچتے' اللہ میاں نے اتنے سے وجود میں اتنی طاقت اور توانائی کا خزانہ چھپا دیا ہے۔ ارے یہ تو طاقت کا پاور ہاؤس ہے......اور وہ بھی ایٹمی پاور ہاؤس۔

پھر ان کی چوں چوں کی آواز۔ وہ عجب سی مشینی آواز نکالتے تھے اور ان کی

چونچیں ہلتی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ کبھی تو مرزا کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ چوزوں کی آواز ہے۔ پھر بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ مشینی آواز کے لہجے بھی تھے۔ چوزے مختلف موقعوں پر مختلف مگر مخصوص آواز نکالتے تھے۔ ڈرتے وقت ان کی آواز اور تھی' بھوک کی آواز اور' اور عام آواز تو ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ چوں.....چوں.....چوں......چوں......

ابھی مرزا ان کی طاقتور توانائی اور پھرتی کو ہضم بھی نہیں کر پائے تھے کہ انہیں پتہ چلا کہ یہ چوزے بہت نازک ہوتے ہیں۔ ایک دن اچانک ہی ایک چوزہ ست پڑنے لگا۔ اس کے ساتھی بھاگتے ہوئے آگے چلے گئے مگر وہ وہیں رک گیا اور کھڑا اونگھنے لگا۔ کبھی وہ ایک آنکھ کھول کر دیکھتا' یوں ہلتا جیسے دوسرے چوزوں کے پاس جانے کا ارادہ کر رہا ہو مگر فوراً ہی سونے لگتا۔ اماں نے اس کا یہ حال دیکھا تو بولیں۔ "یہ تو گیا منے۔"

"ارے نہیں اماں۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔" مرزا نے بے حد یقین سے کہا۔

"تو تو ایسے باتیں کر رہا ہے جیسے یہ انسان ہو۔ دیکھ لینا' یہ اب نہیں بچے گا۔"

"اور ہوا بھی یہی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ چوزہ ختم ہو گیا۔" یہ تو ہو گیا مگر مرزا کے لیے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ مرنے والا چوزہ آمنہ کا تھا' وہ تو آکر خوب روئے گی۔

مرزا نے اس کے متعلق نجمہ بیگم سے بات کی تو وہ بے پروائی سے بولیں۔ "یہ کون سی خاص بات ہے۔ چوزے تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ بچتے ہی کب ہیں۔"

"مگر آمنہ بہت روئے گی۔ بہت ہنگامہ کرے گی۔" اسے کیا بتائیں گے؟

"یہی کہ اس کا چوزہ سردی سے مر گیا۔"

مرزا کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ "نہیں بھئی' میں بچوں کو ابھی سے موت کے متعلق نہیں بتانا چاہتا۔"

نجمہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "کوئی کسی کو آگہی سے نہیں بچا سکتا۔ یہ تو قدرتی عمل ہے۔"

"مجبوری کی الگ بات ہے۔ جب تک بچا سکیں، بچانا چاہیے۔"

"مگر کیسے؟"

"میں ایسا ہی، اسی رنگ کا ایک چوزہ لے آتا ہوں۔ بچوں کے اسکول آنے سے پہلے واپس آجاؤں گا۔"

"چھوڑیں بھی....."

مگر اب مرزا پر دھن سوار ہو گئی تھی۔ انہوں نے گھر سے نکلتے ہوئے بیگم سے کہا۔ "اگر بچے مجھ سے پہلے آ جائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں چوزے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہوں۔"

مرزا بازار کی طرف نکل گئے لیکن چوزے انہیں آسانی سے نہیں ملے۔ وہ بدھ کا دن تو تھا نہیں۔ بدھ بازار میں چوزوں والی عورت باقاعدگی سے آتی تھی۔ مرزا ڈھونڈتے پھرے۔ بڑی مشکل سے انہیں ایک چوزے والا نظر آیا مگر دشواری یہ ہوئی کہ اس کے پاس اسی رنگ کا چوزہ نہیں تھا، جو مرزا کو درکار تھا۔

"رنگ سے کیا فرق پڑتا ہے بابا جی۔" چوزے والے نے کہا۔ "چوزہ تو چوزہ ہے۔"

مرزا ایسے الجھے ہوئے تھے کہ باباجی پر بھی برا نہیں مانے۔ "نہیں بھئی مجھے تو گلابی ہی چاہیے۔" انہوں نے کہا۔

جواب میں چوزے والے نے انہیں جیسے دیکھا، اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ انہیں کھسکا ہوا سمجھ رہا ہے۔

عجیب بات ہوئی، انہیں گلابی رنگ کا چوزہ کہیں نہیں ملا۔ بالاخر انہیں ایک ترکیب سوجھ گئی۔ انہوں نے ایک ہرا چوزہ خرید لیا۔ وہ گھر پہنچے تو بچے اسکول سے واپس آچکے تھے اور بڑی بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ آمنہ کی بے تابی تو دیدنی تھی۔ "میرا چوزہ کہاں ہے دادا؟"

مرزا نے چوزے کو شاپر سے باہر نکالا۔ وہ سیدھا دوسرے چوزوں کی طرف دوڑ گیا۔

"یہ میرا چوزہ نہیں ہے دادا۔ میرا چوزہ تو گلابی تھا۔" آمنہ بس رونے لگی۔

"یہ تمہارا ہی ہے۔" مرزا نے تسلی دی۔ "تمہیں معلوم ہے، اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔"

"اسے ہوا کیا تھا دادا؟"

مرزا گڑبڑا گئے۔ چوزے کی بیماری کے متعلق تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"اسے زکام ہو گیا تھا۔ چھینکیں آئے جا رہی تھیں۔" انہوں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

"پھر ڈاکٹر نے کیا کہا؟" آمنہ نے پوچھا۔ "یہ ٹھیک تو ہو جائے گا دادا؟"

"یہ بالکل ٹھیک ہے گڑیا۔" ڈاکٹر نے کہا، "اسے گلابی رنگ سے الرجی ہے، پھر اس نے اس پر ہرا رنگ کر دیا۔"

"مگر مشتاق بھائی کا چوزہ بھی ہرے رنگ کا ہے۔" آمنہ نے اعتراض کیا۔ "پھر یہ میرے ساتھ بے ایمانی کریں گے۔"

"ہم تمہارے چوزے پر کالے مارکر سے نشان لگا دیتے ہیں۔" مرزا بولے۔

یوں یہ مسئلہ حل ہو گیا!

مرزا چوزوں کو غور سے دیکھتے، مشاہدہ کرتے رہے۔ انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ چوزے بے حد سوشل ہوتے ہیں۔ انہیں تنہا رہنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا کہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ، آگے پیچھے دوڑتے چوزوں میں سے کوئی کسی مکھی کے چکر میں دوسری طرف نکل جاتا، وہاں جیسے ہی مکھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی اور اسے تنہائی کا احساس ہوتا، وہ بری طرح چیخنے لگتا۔ وہ وہی چوں چوں کی آواز ہوتی مگر بے حد طویل۔ مرزا نے چوزوں کے لہجے کو پہلی بار اس آواز سے سمجھا تھا۔ وہ آواز دراصل پکار تھی اور اس میں بے شمار لہجے تھے۔ وہ ہجر کے ماروں کی صدا تھی۔ اس میں فریاد تھی، خوف تھا، التجا تھی، حزن و ملال تھا، گھبراہٹ تھی۔ وہ پکار تھی کہ اے ہم نفس، میں یہاں بہت اکیلا ہوں۔ مجھے اپنے پاس بلا لو یا تم میرے پاس آجاؤ اور یہ بھی کمال تھا کہ دوسرے چوزے اس آواز کو اس کے لہجوں کو سمجھتے تھے۔ یا تو وہ خود اکیلے چوزے کی طرف دوڑ جاتے یا پھر وہ جواب میں آواز دیتے اور تنہا چوزہ اس آواز کے دھاگے سے بندھا ان کے پاس چلا آتا۔

پھر مرزا نے بچوں کو ایک اور بار موت کی آگہی سے بچایا۔ ایک اور چوزہ سردی سے ختم ہو گیا۔ اس بار وہ بدھ کا دن تھا۔ مرزا بہ آسانی مطلوبہ رنگ کا چوزہ خرید لائے۔ بچوں کو اس بار پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ اسکول سے آئے تو معاملہ برابر ہو چکا تھا۔ چوزوں کی تعداد برابر تھی۔ البتہ چوزے کے مالک اشفاق کو تبدیلی کا کچھ احساس ضرور تھا۔ "یہ میرا چوزہ کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"کمزور ہو گیا ہے۔ کھانے پر توجہ نہیں دیتا۔" مرزا نے جلدی سے کہا۔

اشفاق فوراً ہی چوزے کی مدارات میں مصروف ہو گیا۔

لیکن نجمہ بیگم نے سچ کہا تھا کہ کوئی کسی کو آگہی سے نہیں بچا سکتا۔ سو آگہی کا وہ لمحہ بچوں پر آ ہی گیا۔ اس بار چھٹی کا دن تھا اور چوزہ بچوں کے دیکھتے دیکھتے ختم ہو گیا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اسے پھینکنے بھی نہیں دے رہے تھے۔

"بیٹا' یہ مرچکا ہے۔" انہوں نے اشفاق سے کہا۔

بچے نہیں مان رہے تھے۔ انہیں سمجھانے' قائل کرنے میں مرزا نڈھال ہو گئے۔ بچے قائل ہوئے تو دوسری نوعیت کے سوالات شروع کر دیئے۔

"یہ مرنا کیا ہوتا ہے دادا؟"

"کیا سب لوگ مرتے ہیں؟"

"مر کر کہاں جاتے ہیں؟"

"کیا آپ بھی مرجائیں گے دادا؟"

"آپ مر گئے تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا دادا۔"

"میں بھی!" یہ آخری آواز کورس میں تھی۔

مرزا انہیں موت کے بارے میں سمجھاتے رہے۔ موت اللہ کی مرضی ہے۔ کس کو کب آئے گی' صرف اللہ کو خبر ہے۔ اس پر صبر کرنا چاہئے۔ رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔

بچے چوزے کی موت پر خوب روئے مگر بالآخر قانون قدرت کے تحت انہیں صبر آگیا۔ "جب کوئی مرجائے تو کیا کرتے ہیں دادا؟" آفاق نے پوچھا۔

مرزا کہنے والے تھے کہ پھینک دیتے ہیں مگر انہوں نے خود کو روک لیا۔ اب

بچوں نے موت کو سمجھ لیا تھا تو انہیں یہ سمجھانا بھی ضروری تھا کہ وہ محترم ہے۔

"تدفین کی جاتی ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

چنانچہ بلڈنگ کے باہر چوزے کو دفن کیا گیا۔ اس کی قبر بنائی گئی۔ اس پر فاتحہ ہوئی اور سوگوار چوزے کو سیروں مٹی تلے دبا کر گھر واپس آگئے۔ اس روز دیر تک متوفی کی اداؤں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ پھر اشفاق نے کہا۔ "اب مجھے نیا چوزہ دلائیں دادا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" مرزا نے صاف انکار کر دیا۔ دراصل انہیں بھی چوزے کی موت کا دکھ ہوا تھا اور وہ مزید دکھ پالنا نہیں چاہتے تھے۔

چوزے کے تازہ غم سے نڈھال اشفاق کو رونا آگیا۔ "سب کے چوزے ہیں دادا۔ میرا ہی نہیں ہے۔"

مرزا کو ترکیب سوجھ گئی۔ "اب آفاق والا چوزہ تمہارا بھی ہے اور آفاق کا بھی ہے۔"

اس پر خاصی بحث ہوئی مگر بالآخر مرزا کا فیصلہ قبول کر لیا گیا۔

مرزا چوزوں کو دیکھتے اور مشاہدہ کرتے رہے۔ ان پر چوزوں کی ایک افادیت بھی کھلی۔ پہلے تو وہ سمجھ نہیں سکے۔ ہاں' اتنا ان کی سمجھ میں ضرور آگیا کہ گھر میں حشرات الارض کی غیر معمولی کمی واقع ہوئی ہے اور یہ عمل بتدریج ہوا ہے۔ اس کا اندازہ انہیں باتھ روم سے ہوا جہاں کاکروچ بے شمار تھے مگر اب ان کی تعداد کم ہو گئی تھی اور جو تھے' وہ بھی کونوں کھدروں میں چھپے رہتے تھے۔

چوزوں کا ایک معمول ان کے علم میں تھا۔ جیسے وہ کھولے جاتے' پوری رفتار سے کچن کی طرف دوڑتے۔ مرزا کے نزدیک اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ کچن کھانے پینے کا مرکز تھا۔ چوزوں کا اس طرح میلان فطری تھا۔

چوزوں کی دوسری پسندیدہ جگہ باتھ روم تھی۔ کچن سے نمٹ کر وہ اسی تیزی سے باتھ روم کی طرف دوڑتے تھے۔ اس دلچسپی کی وجہ غور کرنے پر بھی مرزا کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ چوزوں کے بارے میں وہ جانتے ہی کچھ نہیں ہیں۔

پھر ایک دن یہ عقدہ بھی کھل گیا؟

اسی رات گیارہ بجے ثمینہ نے آفتاب کو گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا۔ "سنئے.....ذرا جلدی سے چوزوں کو کھول دیجئے۔"

آفتاب اس وقت لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ مرزا صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ آفتاب نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت!"

"جلدی سے کھولیں۔" ثمینہ نے دہرایا۔ وہ کچن کے دروازے پر کھڑی تھی اور کچن کی لائٹ آف تھی۔

مرزا کو تجسس ہوا کہ اتنی رات کو چوزوں کو کیوں کھلوایا جا رہا ہے۔ آفتاب کا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا۔ مرزا نے اس سے کہا۔ "جاؤ' کھول دو چوزوں کو۔"

آفتاب منہ بناتا ہوا اماں کے کمرے کی طرف چل دیا۔

"کوئی خاص بات ہے؟" مرزا نے ثمینہ سے پوچھا۔

"بہت خاص بات ہے ابو۔ یہاں آجایئے۔ پھر تماشا دیکھئے گا۔"

مرزا اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

چوزے پنجرے سے نکلتے ہی میزائل کی طرح اپنے ہدف یعنی کچن کی طرف لپکے۔ ان کے دروازے تک پہنچتے ہی ثمینہ نے کچن کی لائٹ آن کر دی۔ چوزے کچن میں داخل ہوئے۔ مرزا کچن میں جھانک رہے تھے۔

وہ عجیب منظر تھا۔ کچن میں چھوٹے بڑے کاکروچوں کی بہت بڑی فوج موجود تھی۔ روشنی ہوتے ہی وہاں بھگدڑ مچنے لگی جو چوزوں کی انٹری کے ساتھ ہی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

ادھر چوزے کچن میں گھستے ہی پاگل ہو گئے۔ جیسے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو کہ کس کو کھائیں مگر ان کی رفتار ناقابل یقین تھی۔ چند لمحوں میں انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ بچے کھچے کاکروچوں نے ان کونوں کھدروں کا رخ کیا جو چوزوں کی چونچوں سے محفوظ تھے۔ چوزوں نے میدان صاف دیکھا تو کچن کے سنک کے نیچے جا گھسے۔

"یہ سب کیا ہے؟" مرزا نے ثمینہ سے پوچھا۔

"کاکروچوں نے عاجز کر رکھا ہے ابو۔ کیڑے مار دوائیں بھی بے کار ہیں ان کے

آگے۔" ثمینہ نے کہا۔ "چوزے ان کے دشمن ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم چوزوں کے خلاف ہو۔ یہ گندگی کرتے ہیں۔"

"میں اب بھی خلاف ہوں۔ اب بھی یہی کہتی ہوں۔"

"مجھے تم سے اختلاف ہے بیٹی۔" مرزا بولے۔ "یہ جو گندگی کرتے ہیں' وہ چھوٹی ہے مگر بڑی گندگی کو صاف کرتے ہیں۔" وہ خاموش ہوئے۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔ "تمہارے کچن کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوا ہے۔"

"کل پھر دوا منگواؤں گی۔" ثمینہ نے شرمندگی سے کہا۔

مرزا اس رات دیر تک چوزوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ وہ ان کی پھرتی اور برق رفتاری پر حیران تھے۔ کاکروچوں سے ان کا سابقہ پڑتا رہتا تھا اور وہ ان کی تیزی کے قائل تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ کسی کاکروچ کو مار پائیں۔ وہ بڑی تیزی سے حرکت کرتے تھے مگر آج مرزا نے دیکھا کہ چوزوں کی پھرتی کے سامنے کاکروچ ست رفتار لگ رہے تھے۔ چوزے متحرک کاکروچوں پر بے حد درستی کے ساتھ جھپٹتے تھے اور بس بھی نہیں کرتے تھے۔

تو چوزے صفائی کی ضمانت بھی ہیں۔

سونے سے پہلے مرزا بڑبڑائے۔

اس روز کے بعد انہیں چوزوں سے انسیت ہو گئی۔ انہیں ان کی اداؤں پر پیار آنے لگا۔ انہوں نے دل میں اعتراف کیا کہ وہ خوبصورت بھی بہت ہیں۔ اماں کی ایک بھولی بسری بات انہیں یاد آئی۔ اماں کہتی تھیں۔ جتنے مرغی کے بچے خوبصورت ہوتے ہیں' اتنے بطخ کے بچے بدصورت ہوتے ہیں۔

بچوں کو مسلسل ٹوکا جاتا تھا کہ چوزوں کو ہاتھ میں نہ پکڑیں۔ اماں اکثر انہیں سمجھاتیں کہ دیکھو' یہ بہت نازک بھی ہوتے ہیں۔ ذرا سے دباؤ سے مرجاتے ہیں اور ہاتھ میں لیے رہو تو یہ بڑھتے بھی نہیں۔ چھوٹے رہ جاتے ہیں مگر بچے کہاں باز آنے والے تھے۔ آخر وہ ان کے چوزے تھے۔

ایک دن اسی کے نتیجے میں ایک حادثہ رونما ہو گیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ مرزا ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ اماں بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ مرزا چوتھی رکعت میں

تھے کہ روبینہ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اتنے زور سے نہیں پکڑتے چوزے کو، چھوڑو اسے۔"

مرزا آیت پڑھتے پڑھتے بھول گئے کہ کیا پڑھ رہے تھے۔ انہیں سورت دوبارہ شروع کرنی پڑی۔

مگر اگلے ہی لمحے روبینہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ "دیکھا.....مار دیا نا۔"

مرزا نے جیسے تیسے رکعت پوری کی، سلام پھیرا اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئے۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ روبینہ آمنہ کے چوزے کو ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ وہ اس کی چونچ کھول کر اس میں دھیرے دھیرے سانس دے رہی تھی۔ پھر اس نے چوزے کو دیکھا اور دروازے کے باہر دھوپ میں رکھ دیا۔ "مشکل ہے۔ یہ مرچکا ہے۔" وہ بولی۔

مرزا نے چوزے کو دیکھا۔ ننھا چوزہ.....اس کے جسم میں جنبش ہی نہیں تھی۔

مرزا کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ انہیں لگا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں گے۔ اگر آمنہ نہ رو پڑتی تو شاید وہ بھی رو دیتے۔ وہ خود کو بھول کر آمنہ کو دلاسا دینے لگے جو خوفزدہ بھی تھی کہ چوزہ اس کی غلطی کی وجہ سے مرا ہے۔

"روؤ مت.....ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے آمنہ سے کہا اور روبینہ کی طرف مڑے۔ "کیا خیال ہے؟"

"ختم ہو چکا ہے ابو۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کے اندر ایک یقین سا ابھرا۔ "اسے پھینکنا مت بیٹی۔ ہو سکتا ہے، زندہ ہو۔"

روبینہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ ویسے اس کے چہرے پر مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

مرزا پھر نماز پڑھنے چلے گئے لیکن تمام وقت وہ چوزے کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کا دل، ان کا رواں رواں اس کے لیے دعا کر رہا تھا۔ نماز کے بعد انہوں نے صرف چوزے کے لیے دعا مانگی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بے حد عاجزی سے گڑگڑائے۔ "اے اللہ پاک، زندگی اور موت پر صرف آپ کا اختیار ہے......"

باہر سے مشتاق کی آواز آئی۔ "خالہ...... دیکھیں یہ ہل رہا ہے۔"

مرزا دعا مانگتے رہے۔ "آپ چاہیں تو اس چوزے کو نئی زندگی دے دیں۔ آپ چاہیں تو ہمارے گھر میں پلنے والے یہ چوزے بڑے ہو جائیں۔ آپ ہی میرے بچوں کو ان کے دکھ سے بچا سکتے ہیں۔ انہیں زندگی دے دیجئے میرے مالک....."

وہ دعا کرکے اٹھے تو انہیں اپنے اندر روشنی سی محسوس ہوئی۔ باہر آئے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ چوزہ، جس میں تھوڑی دیر پہلے جنبش تک نہیں تھی، اب دوسرے چوزوں کے ساتھ یوں دوڑ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایک طرف اماں بیٹھی اس چوزے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ مرزا کو دیکھتے ہی بولیں۔ "اس وقت تو منے اس کے لیے تڑپ کر دعا کی ہے میں نے، دل سے نکلی تھی۔"

مرزا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ کیا بتاتے کہ دعا ان کے وجود کی بھی گہرائیوں سے نکلی تھی۔

وہ اللہ کی عنایت تھی۔ کرشمہ تھا کہ وہ چوزہ نہ صرف زندہ رہا بلکہ سب سے سخت جان ثابت ہوا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا...... کمزور تھا مگر اس کے باوجود سب سے زور آور نکلا بلکہ بعد میں وہ لڑاکا بھی بن گیا۔ دوسرے چوزوں کو مارنے لگا۔

○

دن گزرتے رہے۔ سردی ختم ہو گئی۔ مئی کا مہینہ آیا۔ چوزے اب اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ انہیں چوزے کہنا زیادتی لگتا تھا یعنی وہ نہ مرغیاں تھیں، نہ چوزے، درمیان میں کہیں تھے۔

مرزا کا مشاہدہ خاصا وسیع ہو چکا تھا۔ چوزوں میں اس عرصے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، وہ سب دیکھتے رہے تھے۔ چوزوں کے بڑے پر نکلے تھے۔ رنگین پر نیچے دبتے گئے تھے۔ اب تو بس کہیں کہیں سے رنگ کی جھلک نظر آجاتی تھی ورنہ وہ بالکل سفید ہو گئے تھے۔ مرزا انہیں اور حیرت سے سوچتے، کیا یہی وہ خوبصورت چوزے ہیں جنہیں دیکھ کر وہ اللہ کی شان تخلیق کے بارے میں سوچتے تھے۔ ننھی سی چلتی پھرتی

خوبصورت مشین' جس میں سب ہی پرزے موجود تھے اور جو بہت برق رفتار تھی۔

چوزے بڑے ہوئے تو گھر میں ایک بحران پیدا ہوگیا۔ بدمزگی ہونے لگی۔ آفتاب' ظفر اور ثمینہ تو شروع ہی سے ان کے مخالف تھے۔ روبینہ ان کی دیکھ ریکھ کرتی تھی۔ وہ بیٹ کرتے پھرتے اور وہ صاف کرتی پھرتی مگر پچھلے ایک مہینے سے وہ چوزوں کے سلسلے میں بچوں کے ذہن کو تیار کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"اللہ نے سب کچھ انسان کے لیے بنایا ہے۔" وہ بچوں سے کہتی۔ "تمام جانور .....کچھ کھانے کے لیے ہیں' کچھ بوجھ اٹھانے کے لئے اور دوسرے کام بھی آتے ہیں۔"

"اور کس کام آسکتے ہیں جانور؟" مشتاق نے پرخیال لہجے میں پوچھا۔

"ان کی کھالوں سے چمڑا بنتا ہے اور چمڑے سے جوتے' بیگ' جیکٹ' پرس .... کتنی ہی چیزیں بنتی ہیں۔"

"اور ہمارے چوزے؟" آمنہ نے سوال اٹھایا۔

"ان کے بھی فائدے ہیں۔ ان میں سے جو مرغی بنیں گے' وہ انڈے دیں گے اور جو مرغے بنیں گے' انہیں ہم ذبح کرکے پکا سکتے ہیں۔"

"اور تو کچھ نہیں بن سکتا ان سے؟" اشفاق نے پوچھا۔

"ارے واہ' ان کے پروں کا تکیہ تو ایسا بنے گا کہ سر رکھتے ہی نیند آجائے۔" روبینہ نے کہا۔

تینوں لڑکے ایکسائیٹڈ ہو گئے۔ "مجھے تو بروسٹ چکن بہت پسند ہے۔" مشتاق بولا۔

"بروسٹ چکن!" آفاق نے حقارت سے کہا۔ "وہ تو ایک بار کھایا اور ختم۔ اللہ کرے' ہمارا والا مرغی نکلے۔ ہم تو روز انڈے کھائیں گے۔" کیوں اشفاق؟

اشفاق چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔ "جو بھی ہو' ٹھیک ہے۔ مجھے دونوں چیزیں اچھی لگتی ہیں۔"

اماں ان کے کاٹے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے مداخلت کی۔ اپنے اتنے چہیتے چوزوں کو کاٹ کر کھا جاؤ گے تم لوگ؟

"اللہ نے انہیں اسی لئے بنایا ہے۔" اشفاق نے اکڑ کر کہا۔

"اور کیا..... ایسا نہ ہو تو گوشت کہاں سے ملے گا ہم کو۔" آفاق نے اس کی تائید کی۔

مشتاق ڈانواں ڈول تھا مگر آمنہ پر رقت طاری ہوگئی۔ میں تو اپنے والے کو نہیں کاٹنے دوں گی۔ اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

اب تو مرزا بھی سوچ رہے تھے کہ ان کا کیا بنے گا۔ چلو چوزے تو پل گئے مگر فلیٹ میں تو مرغیاں نہیں پل سکتیں۔ وہ فکرمند ہو گئے۔ جو کہانی انہوں نے شروع کی تھی' اب سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ چوزوں سے انسیت بھی ہو گئی تھی۔ ان کو کاٹنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

بحران سنگین تر ہوتا جا رہا تھا۔ چوزے اب بڑی بڑی بیٹ کرنے لگے تھے اور ان کے بیٹ کرنے کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ کسی بھی وقت' کہیں بھی کر دیتے بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ ہروقت بیٹ ہی کرتے رہتے تھے اور اب بیٹ کی مقدار بھی زیادہ تھی۔ روبینہ کو بھی گھن آنے لگی تھی۔ اس سے صاف نہیں کیا جاتا تھا۔ اس پر ثمینہ سے اس کی حجت ہونے لگی۔ "صاف کرو ناں۔" ثمینہ کہتی۔

"تو اب چوبیس گھنٹے یہی کرتی رہوں۔" روبینہ تنک کر کہتی۔

"تم نے ہی یہ ذمہ داری قبول کی تھی۔"

"مگر اتنے بڑوں کی نہیں۔"

چنانچہ چوزوں کا ایک اہم حامی کم ہو گیا۔ آفتاب اور ظفر پہلے ہی ان کے خلاف تھے۔ اب گندگی دیکھ کر وہ اور خلاف ہو گئے۔ ابو اور دادی کے لحاظ میں وہ کچھ نہیں کہتے تھے لیکن چوزوں کو دیکھتے ہی ان کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔

چوزوں کے حامی تعداد میں کم لیکن طاقت میں زیادہ تھے۔ پھر جیسے جیسے چوزوں کی گندگی بڑھتی گئی' مرزا کی حمایت کم ہوتی گئی لیکن اماں کی حمایت اٹل تھی۔ مرزا کا انداز البتہ نیم دلانہ ہوگیا تھا۔ نجمہ بیگم ابتداء ہی سے غیرجانبدار تھیں۔

ایک دن یہ مقدمہ اماں کی عدالت عظمیٰ میں پیش ہوگیا۔

"اب چوزے گھر میں نہیں رہ سکتے۔" ثمینہ نے نہایت عاجزی سے فریاد کرنے

والے انداز میں استغاثہ پیش کیا۔

"کیوں دلہن، ایسا کیا ہو گیا؟" چیف جسٹس اماں نے نرم لہجے میں سوال اٹھایا۔

"اب یہ بہت زیادہ گندگی کرنے لگے ہیں۔"

"پہلے بھی کرتے تھے۔" اماں روبینہ کی طرف مڑیں، "تم نے صفائی کی ذمہ داری لی تھی۔"

"جی بڑی اماں اور کرتی بھی رہی مگر اب یہ بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی بیٹ زیادہ بھی ہوتی ہے اور یہ بدبودار بھی۔" روبینہ نے جواب دیا۔

"تو کیا ہوا، پہلے بھی بیٹ کرتے تھے، اب بھی کرتے ہیں۔" اماں نے بے نیازی سے کہا۔

"جب میں اور اب میں بڑا فرق ہے، بڑی اماں۔" روبینہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"تو ان کے نیچے تھیلیاں باندھ دیں۔" آفاق نے تجویز پیش کی۔ پھر فوراً ہی نظیر بھی پیش کر دی۔ "بکریوں کے بھی تو باندھتے ہیں۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔ اماں بولیں۔ "میرے بچے، مرغیوں کے تو تھیلیاں نہیں باندھی جا سکتیں۔"

"اور دادی، دیکھنے میں بھی اتنے بدصورت اور گندے ہو گئے ہیں کہ دیکھ کر ہی گھن آتی ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"انہیں دیکھنے کے بعد کچھ کھا نہیں سکتا میں۔" ظفر بولا۔

مرزا نے دل میں تائید کی۔ چوزے واقعی بہت گندے ہو گئے تھے مگر انہوں نے منہ سے یہ بات نہیں کہی۔

"اور یقین کریں، پورے گھر میں ان کی بدبو رچ بس گئی ہے۔" ثمینہ نے کہا۔

"یہ صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ سانس لو تو بدبو آتی ہے۔"

اماں نے اور چاروں بچوں نے گہری گہری سانسیں لیں، پھر آمنہ بولی۔ "ہمیں تو بدبو نہیں آتی۔"

"عادی ہو گئی ہو بدبو کی۔" ثمینہ نے جل کر کہا۔

اماں نے کہا۔ "گندے تو یہ لگیں گے۔ تمام وقت کچن کے سنک کے نیچے گھسائے رکھتی ہو تم لوگ۔ محض کاکروچوں کی صفائی کے لیے۔ کیسی خودغرضی کی بات ہے۔" پھر انہوں نے گہری سانس لی۔ "اچھا تم لوگ چاہتے کیا ہو؟"

ثمینہ کے چہرے پر پہلی بار اطمینان نظر آیا۔ تاہم اس نے عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ "فیصلہ تو آپ بڑوں کو کرنا ہے۔" وہ بولی۔ "ہم چھوٹے تو بس تجویز پیش کر سکتے ہیں۔"

"ہمیں وہی کرنا چاہیے جس کے لیے اللہ نے انہیں بنایا ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"اللہ کا حکم ہے، کھانے کی چیز کو کھانا بھی شکر ادا کرنا ہے۔"

"کھایا تو انڈا بھی جاتا ہے۔" اماں نے رولنگ دی۔

مرزا کو تین رات پہلے کا واقعہ یاد آیا۔ ایک عجیب و غریب آواز کی وجہ سے ان کی نیند اچٹی تھی اور وہ ڈراؤنی آواز انہیں مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے اٹھ کر کھوجنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں وہ پنجرے تک جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک چوزہ وہ آواز نکال رہا ہے۔ خاصی دیر کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ وہ بانگ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

"مجھے معلوم ہے، یہ آمنہ والا مرغا ہے۔" انہوں نے شہادت پیش کی۔ "وہ آج کل بانگ دینے کی پریکٹس کر رہا ہے۔"

"بس تو طے ہو گیا۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

کیا طے ہو گیا؟ اماں نے حیرت سے کہا۔

"یہی کہ مزیدار چکن بریانی بنے گی۔" ظفر بولا۔

بچوں کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ معاملہ سنگین ہے۔ وہ رونے لگے۔ اماں نے انہیں روتے دیکھا تو تڑپ کر چلائیں، کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ کتنے بے درد ہو گئے ہو۔ بچوں کے سامنے ان کے محبت سے پالے ہوئے چوزوں کو ذبح کر کے پکانے کی بات کرتے ہو۔ ارے تم وہی ہو نا کہ اپنے پالتو جانوروں کی تکلیف پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے تھے۔ کھانا پینا چھوٹ جاتا تھا تمہارا۔

" وہ ہمارا بچپن تھا اماں۔" آفتاب نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو اسے ایسے بھول گئے کہ اپنے بچوں کے بچپن کا بھی احترام نہیں رہا۔" اماں نے اسے لتاڑا۔ "ارے لوگ تو اپنے بچپن کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور یاد کر کے خوش ہوتے ہیں۔"

آفتاب اور ظفر شرمندہ نظر آنے لگے۔ "اماں' ہم تو کچھ نہیں کہہ رہے ہیں۔" ظفر نے کہا۔ "بس ان کی گندگی کی بات ہے۔ آپ خود دیکھ لیں۔"

نجمہ بیگم اب تک خاموش رہی تھیں۔ انہوں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "بات یہ ہے کہ ہر وقت سنک کے نیچے گھسے رہنے کی وجہ سے یہ گندے ہو گئے ہیں۔ مرغیوں کا یہ ہے کہ مٹی میں پھرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ مٹی میں لوٹتی ہیں اور صاف ستھری ہو جاتی ہیں۔ انہیں بھی مٹی نصیب ہو جائے تو یہ بھی خوبصورت اور صاف ستھرے ہو جائیں گے۔"

مرزا نے منہ بسورتے ہوئے بچوں کو دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی فیصلہ کر لیا کہ چوزوں کو ذبح نہیں ہونے دیں گے۔ بچوں کی خوشی کی خاطر گندگی بھی گوارا ہے۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ "یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اور بچے انہیں گھنٹے دو گھنٹے کے لیے لے جا کر باہر چھوڑ دیں گے۔"

"لیکن ان کی گندگی' بیٹ اور بدبو۔" روبینہ نے گھبرا کر کہا۔

ثمینہ بھی یہی بات سوچ رہی تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ براہ راست بات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اس نے بہت تیزی سے ایک ترکیب سوچ لی۔ "نیچے تو وہ کالی بلی انہیں کھا جائے گی۔ کب سے ان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ دن میں دسیوں بار اوپر آتی ہے۔"

"بلی!" مرزا اچھل پڑے۔

"کالی بلی!" نجمہ بیگم نے گھبرا کر کہا۔

"ایک کالی بلی دیکھی تو میں نے بھی ہے۔" اماں نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "وہی نا' جو بالکل کالی ہے۔ کہیں کوئی چھوٹا سا داغ بھی نہیں۔"

"جی بڑی اماں' بالکل کالی ہے۔ بار بار بے تاب ہو کر اوپر آتی ہے اور ہمارے دروازے کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جاتی ہے۔" ثمینہ کی بات غلط بھی نہیں تھی۔

بس وہ بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی تھی۔

"اللہ پناہ رکھے کالی بلی سے۔" اماں کے لہجے میں تشویش تھی۔ "دروازہ بند رکھا کرو دلہن۔ اس موذی سے احتیاط ہی کرو۔"

"لیکن اب چوزوں کو نیچے لے کر جائیں گے تو وہ خدانخواستہ موقع پا کر ان پر جھپٹے گی ضرور۔ ان کی گھات میں بیٹھی ہے وہ۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم اس موذی کو ختم کر دیں گے۔" آفاق نے جذباتی ہو کر کہا۔

اماں یہ سن کر دہل گئیں۔ "ایسا سوچنا بھی نہیں۔ خبردار جو تم میں سے کسی نے اسے ہشکارا بھی۔ تم نہیں جانتے' وہ کالی بلی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔" اشفاق نے اکڑ کر کہا۔ "ہم اسے مار ڈالیں گے۔"

اماں کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ بچوں کو سمجھانے لگیں۔ بالآخر ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ کالی بلی سے کبھی نہیں الجھیں گے۔ پھر وہ مرزا کی طرف مڑیں۔ "منے......ساجدہ کا گھر تو بہت بڑا ہے ناں اور ہر طرح کے جانور بھی پلے ہیں ان کے ہاں؟"

"جی اماں' مرغیاں بھی ہیں۔"

"تو ایسا کرتے ہیں ان چوزوں کو ان کے ہاں بھجوا دیتے ہیں۔" اماں بولیں۔ بچوں نے احتجاج کیا تو انہوں نے کہا۔ "پہلے پوری بات سن لو۔ ہم یہ شرط رکھیں گے کہ ان کے آدھے انڈے وہ ہمیں بھجوایا کریں گی' تم لوگ کھایا کرنا۔"

بچے اب بھی تیار نہیں تھے۔ مرزا نے انہیں سمجھایا۔ "دیکھو' تم ان سے محبت کرتے ہو ناں تو انہیں زندہ ہی دیکھنا چاہتے ہوگے۔ یہاں یہ یا تو بلی کا لقمہ بن جائیں گے یا ذبح کر دیئے جائیں گے۔ اس سے تو یہ بہتر ہے ناں کہ سجو آپا کے ہاں زندہ رہیں اور انڈے دیں۔ یوں تم ان کے انڈے بھی کھا سکو گے۔"

بچے سوچنے لگے' پھر انہوں نے متفقہ طور پر ایک قرارداد پیش کی۔ "ٹھیک ہے دادا مگر آپ ان کے بدلے ہمیں چھوٹے چوزے لا کر دیں گے۔"

مرزا نے چوزوں کے مخالفین کی طرف دیکھا اور بولے۔ "اس میں کوئی حرج

نہیں۔ چوزے بڑے ہونے لگیں تو انہیں سجو آپا کے ہاں بھجوا دیا جائے۔ چھوٹے چوزے گھر میں رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

مخالفین نے یہ سوچ کر قرارداد منظور کر لی کہ بڑے شر سے نجات مل رہی ہے۔ تاہم ثمینہ نے ایک ترمیم پیش کی۔ "لیکن کوئی چوزہ مر گیا تو اس کی جگہ نیا چوزہ نہیں لایا جائے گا۔"

وہ ترمیم بھی منظور کر لی گئی۔ اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے بڑے دور رس نتائج نکلیں گے۔

چوزے بہرحال سجو آپا کے ہاں بھجوا دیئے گئے۔ ان کے بدلے جو چوزوں کی نئی کھیپ آئی' اس میں چوزی بھی تھا۔

کلاک نے ایک بجایا تو مرزا چونکے۔ ارے......نماز کا وقت ہو گیا۔ وہ وضو کرنے کے لیے باتھ روم میں گھسے' چوزی بھی ان کے ساتھ تھا۔

مرزا وضو کرکے باہر آئے ہی تھے کہ ظفر آگیا۔ اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد مرزا نے پوچھا۔ "تم اس وقت کیسے؟"

"آپ بھول گئے ابو۔ مجھے آپ کے لیے ڈاکٹر اختر سے اپائنٹ منٹ لانا تھا۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔"

"تو نہیں ملا نا۔" مرزا نے پرامید لہجے میں کہا۔ پھر بے پروائی سے بولے۔ "کوئی بات نہیں بیٹے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' تم فکر نہ کرو۔"

"جی نہیں ابو۔ میں آپ کا سات بجے کا اپائنٹ منٹ لے آیا ہوں۔"

"یہ سنتے ہی مرزا کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔"

"آپ پہنچ جائیں گے نا۔ مطب تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کہاں ہے۔ کہیں تو میں آجاؤں"۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ تمہارے کام کا حرج ہوگا۔ میں اکیلا جا سکتا ہوں۔" انہوں نے کہا' پھر ان کے لہجے میں خوف آگیا۔ "وہ داڑھ نکالیں گے تو نہیں۔"

"یہ تو وہ دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔"

"مجھے تکلیف سے بہت ڈر لگتا ہے بیٹے۔ داڑھ نکالنے میں تو بہت تکلیف ہوتی

ہوگی۔"

"پتہ بھی نہیں چلتا۔ انجکشن لگا کر سن کر دیتے ہیں۔"

"ارے تو انجکشن لگنے میں تو تکلیف ہوتی ہوگی۔"

ظفر نے انہیں بہت غور سے دیکھا۔ اس نے سوچا' ابو شاید جائیں گے ہی نہیں۔ انہیں بہلانا ضروری ہے۔ "میرے خیال میں داڑھ نکالنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ ڈاکٹر اختر اس کے بہت خلاف ہیں۔ ان کے پاس ایک ایسی دوا ہے جس سے ہلتی ہوئی داڑھ بغیر تکلیف کے خود ہی نکل جاتی ہے۔ بہت بڑے اسپیشلسٹ ہیں وہ۔"

"یہ سن کر مرزا کے چہرے پر بحالی کا رنگ ابھرا۔ تب تو ٹھیک ہے۔"

"آپ ضرور چلے جائیے گا۔ میں نے بڑی خوشامد کرکے آج کا اپائنٹ منٹ لیا ہے۔"

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔"

مگر ظفر یوں بے فکر ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے دادی کو مطلع کر دیا اور سمجھا دیا کہ چھ بجے انہیں گھر سے دھکیل دیں۔

مرزا اپنے عبادت کے کمرے میں چلے گئے۔ چوزی اب بھی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ نماز کی نیت کرکے کھڑے ہو گئے۔

وہ نماز پڑھتے رہے۔ چوزی بڑے سکون اور دلجمعی سے جا نماز سے بالکل ملا بیٹھا رہا۔ وہ ان کے حیطہ نگاہ کے اندر بیٹھا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ نماز کے دوران میں ان کی نظر میں رہتا تھا۔ ابتداء میں انہوں نے اسے ہٹانے کی بہت کوشش کی مگر نیت کرنے کے بعد ان کا اختیار نہیں رہتا تھا اور چوزہ دوبارہ اسی جگہ آبیٹھتا تھا۔ مجبوراً انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ اب یہ بھی تھا کہ اس کی موجودگی سے ان کے ارتکاز میں خلل بھی نہیں پڑتا تھا۔

انہوں نے نماز پوری کی اور دعا کے ہاتھ اٹھائے تو چوزی پھدک کر ان کی گود میں آبیٹھا۔ مرزا مسکرائے۔ چوزی کی سمجھداری پر انہیں حیرت ہوتی تھی۔ پچھلے پندرہ دن سے وہ یہ حرکت کر رہا تھا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ نماز ختم ہو جائے تو وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ ایسے میں وہ ان سے بے تکلفی کر سکتا ہے۔

دعا کے بعد وہ تسبیح پڑھنے لگے۔ چوزی ان کی متحرک انگلیوں پر چونچیں مارتا رہا۔

پھر مرزا معمول کے مطابق اٹھے اور شیلف کی طرف بڑھے۔ انہوں نے قرآن شریف نکالا اور تلاوت کے لیے بیٹھ گئے۔ قرآن شریف کھولنے سے پہلے انہوں نے چوزی کو دیکھا۔ وہ ہر روز کی طرح اپنے مخصوص انداز میں مودب ہو کر بیٹھ گیا۔

"شاباش چوزی.....دیکھ اب بدتمیزی نہ کرنا۔" انہوں نے چوزی سے کہا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس معاملے میں چوزی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس معاملے میں وہ پہلے دن سے باادب رہا تھا۔

وہ تلاوت کرتے رہے اور چوزی ان کے پہلو میں بطخ کے سے انداز میں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، پھر دھیرے دھیرے اس کی چونچ جھکتی گئی اور اس کے پوٹے سے جا لگی۔ وہ سو چکا تھا۔

قرآن پاک پڑھتے وقت مرزا کی ایک خاص کیفیت ہوت تھی۔ ان کا اپنا ہی ایک انداز تھا۔ یہ بات سچ ہے کہ اگر کوئی قرآن کو محبت اور عقیدت سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس پر خاص کرم فرماتے ہیں اور وہ شخص قرآن فہمی میں بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مرزا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ برسوں سے وہ دل لگا کر ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھ رہے تھے۔ حالانکہ عربی زبان انہیں نہیں آتی تھی مگر اب وہ قرآن پاک کے بیشتر الفاظ کے معانی سے باخبر ہو چکے تھے بلکہ ایک ایک لفظ کے کئی مطالب سے وہ باخبر تھے۔ کسی آیت میں اس لفظ کا کیا مطلب ہے، وہ جانتے تھے۔ اب وہ کوئی آیت پڑھتے تو ذہن کے ایک گوشے میں ایک اسکرین پر اس آیت کا مفہوم خودکار انداز میں نمودار ہو جاتا تھا۔ انہیں ترجمے کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی مگر پھر بھی آیت کی تلاوت کے بعد وہ بے اختیار ترجمہ پڑھتے تھے۔ یہ برسوں کی عادت تھی ان کی۔ وہ اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ سوچتے، استعداد ایسے ہی بڑھتی ہے۔ آیت کو دھیان سے نہ پڑھو، ترجمہ دیکھو، کئی بار پڑھو۔ غور کرنے کی کوشش کرو حالانکہ غور نہیں کیا جاتا، پھر بھی نظر جما کر ذہن مرتکز کر کے دیکھتے رہو تو کسی لمحے نگاہوں میں نور کا جھماکا سا ہوتا ہے اور آیت کا ایک نیا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ یہ اللہ کی عنایت ہے جو سعی سے حاصل ہوتی ہے اور جب وہ چاہے تو بغیر

کوشش کے بھی بندے کو روشنی دے دیتا ہے۔

سو مرزا کیفیت میں پڑھتے تھے۔ وہ بڑی دھیمی اور شیریں آواز اور بے حد عاجزی کے ساتھ تلاوت کا آغاز کرتے مگر چند لمحوں میں ان کا خود پر اختیار ختم ہو جاتا۔ وہ کلام الٰہی کے ساتھ بہنے لگتے۔ اللہ اپنے دشمنوں، کافروں کو چیلنج فرماتا تو ان کی آواز بلند ہو جاتی۔ لہجے میں للکار آجاتی۔ مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ کوئی تنبیہی آیت پڑھتے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ آواز ڈوبنے لگتی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ خوف سے ان کا وجود شل ہو جاتا۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتیں۔ وہ دیر تک استغفار کرتے۔ اے اللہ، میری مغفرت فرما دیجئے۔ مجھے بخش دیجئے۔ مجھے اپنے قہر سے محفوظ فرما دیجئے اور کوئی آیت مبشرہ تلاوت کرتے تو جھومتے۔ گھگھیا کر اللہ سے دعا کرتے۔ مالک مجھے ان بندوں میں شامل فرما لیجئے جن سے آپ نے ان عنایات کا وعدہ فرمایا ہے۔ مجھے بھی نواز دیجئے۔ اگرچہ میں اس قابل نہیں لیکن آپ وہ ہیں کہ جسے چاہیں، بے حساب نواز دیں۔ مختصر یہ کہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت آیات کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی۔ انہیں گرد و پیش کا ہوش نہیں رہتا تھا۔

اس دوپہر مرزا نے نشانی کے مطابق قرآن پاک کو کھولا۔ صفحہ سامنے آتے ہی انہیں یاد آیا کہ آج انہیں سورہ رحمٰن پڑھنی ہے۔ وہ خوش ہو گئے۔ یہ سورہ مبارکہ انہیں اس وقت سے پسند تھی جب وہ مہینوں میں کبھی ایک بار قرآن پڑھتے تھے۔ اس کی تلاوت سننا بھی انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ جب بھی انہیں فرصت ہوتی، وہ سورہ رحمٰن سنتے یا خود پڑھتے۔ اس سے شاید انہیں کوئی خاص نسبت تھی۔

پھر انہوں نے ایک پنج سورے میں پڑھا کہ جو شخص سورہ رحمٰن کی تلاوت کرتا ہے، وہ گویا اپنے رب کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے۔ یہ پڑھ کر ان کے دل میں ایک فاسد خیال آیا۔ انہوں نے دل میں کہا۔ میں تو ویسے ہی اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔ اس وقت انہیں نہیں معلوم تھا کہ اللہ کا شکر ادا کرنا ناممکن ہے۔

بعد میں انہوں نے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا اور اسے سمجھنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ تب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں کئی جگہ اللہ نے انسانوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ شکر کم ہی ادا کرتے ہیں۔ ناشکرا پن بہت کرتے ہیں۔ جب بندے پر

مصیبت آتی ہے تو رو رو کر اللہ کو پکارتا ہے..... فریادیں کرتا ہے اور جب اللہ مصیبت دور فرما دیتا ہے تو وہ سب سے پہلے اللہ سے منہ پھیرتا ہے جیسے جانتا ہی نہیں اور یہ بھی ہے کہ وہ اپنی شکر گزاری کا رخ اس بندے کی طرف کر دیتا ہے جسے اللہ نے اس کی مصیبت دور کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ حالانکہ اصل میں اسے اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے مگر وہ اللہ کو بھول جاتا ہے۔

ایسی آیات پڑھتے وقت ہمیشہ کی طرح مرزا کی گردن اکڑ جاتی۔ وہ دل میں کہتے......میں ایسا نہیں ہوں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ یہ تو انہیں بعد میں پتہ چلا کہ وہ ان کی جہالت تھی ورنہ اللہ کا شکر تو درحقیقت ادا نہیں کیا جا سکتا۔ بندہ اس سے عاجز ہے۔ یہ کام اس کے بس کا ہے ہی نہیں۔

مرزا نے پہلی بار سورہ رحمٰن ترجمے کے ساتھ پڑھی تو ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا مگر جب وہ باقاعدگی سے قرآن حکیم پڑھتے رہے اور ہر چیز پر غور کرتے رہے تو اللہ نے انہیں فہم اور استعداد سے نوازا۔ تب پہلی بار انہوں نے سمجھا کہ نعمتوں کا' اللہ کی عنایتوں کا شمار ممکن ہی نہیں۔ ایسے میں کوئی کیسے شکر کا حق ادا کر سکتا ہے۔ پھر وہ اپنے اس گمان پر استغفار کرتے رہے کہ انہوں نے خود کو شکر گزار بندہ سمجھا۔

انہوں نے تلاوت شروع کی۔ انہیں یاد آیا کہ پہلی بار انہوں نے ناشکرے پن کا ادراک یہیں سے کیا تھا۔

وہ شاید باقاعدگی سے تلاوت کے بعد چھٹی یا ساتویں مرتبہ سورہ رحمٰن پر پہنچے تھے۔ انہوں نے تلاوت شروع کی۔ الرحمٰن علم القرآن۔ اللہ جو بڑا مہربان ہے' سکھایا اسی نے قرآن۔ مرزا نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ بے شک اللہ بہت بڑا مہربان ہے۔ یہ انہوں نے دل کی گہرائی سے لیکن عادتاً کہا تھا مگر اسی لمحے ان کے وجود میں روشنی سی ہو گئی۔ نظر کے سامنے ایک دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک اور بند دروازہ نظر آ رہا تھا۔

حیرت سے مرزا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اے اللہ' آپ ہی بصیرت عطا فرماتے ہیں ورنہ ہم تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔ میں کب سے پڑھ رہا ہوں مگر ایک لمحے کے لئے بھی سمجھ نہیں سکا۔ اے اللہ' آپ کا

شکر ہے کہ آپ نے مجھے فہم عطا فرمائی۔

وہ فہم کے پہلے دروازے میں داخل ہو گئے۔

اس لمحے مرزا عجب متضاد کیفیات کے اسیر تھے۔ انہیں ندامت بھی تھی' پچھتاوا بھی تھا اور خوشی بھی تھی۔ ندامت اس بات پر تھی کہ وہ اللہ کو مہربان کہتے اور مانتے تھے لیکن انہوں نے جاننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ کبھی غور ہی نہیں کیا اللہ کی مہربانیوں پر۔ وہ یہ ایسے ہی کہتے تھے جیسے کوئی کسی انسان کے لیے کہتا ہے کہ وہ بہت مہربان آدمی ہے۔ کتنی بری بات ہے۔ انہیں سوچ کر پچھتاوا ہونے لگا۔ بہت بڑی بات ایسے سرسری انداز میں کہنا' یہ تو گستاخی ہے۔ ارے..... اللہ تو رحمت کا منبع ہے۔ اس کی صفات اسی سے شروع ہوتی ہیں اور اسی پر ان کی انتہا ہوتی ہے۔ وہی اول ہے' وہی آخر ہے۔ وہ اپنی صفت رحمانی کا پرتو کسی پر ڈال دے تو وہ شخص بے حد مہربان انسان کہلاتا ہے۔ اللہ کی مہربانی کا مکمل تصور تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

انہیں پچھتاوا تھا کہ اللہ کی مہربانیوں کے متعلق سوچے بغیر وہ اسے بے حد مہربان کہتے تھے۔ گویا وہ بے حد سطحی اور منہ زبانی بات تھی۔ انہوں نے کبھی اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کتنا مہربان ہے۔ یہ بات تو بندگی کے خلاف ہے۔

اور انہیں خوشی تھی کہ اللہ نے انہی روشنی عطا فرمائی۔ وہ رحمٰن کو سمجھنے کے مرحلے میں داخل ہوئے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ اس پر غور کرتے رہیں۔ انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان پر آگہی کا دروازہ کھولا۔

اب وہ دروازے کے اندر کھڑے تھے۔ وہ جہان معنی تھا۔ اللہ جو بہت بڑا مہربان ہے۔ سکھایا ہے اسی نے قرآن۔ یہ کتنی بڑی اور بین سچائی ہے۔ وہ قرآن پڑھتے ہیں' اس سے انہیں روشنی عطا ہوتی ہے۔ یہ آیت بھی وہ کئی بار پڑھ چکے ہیں مگر کبھی انہیں خیال نہیں آیا کہ یہ اللہ کی بہت بڑی.....بہت بڑی مہربانی ہے اور اس پر انہیں اللہ کا شکر......بہت شکر ادا کرنا چاہئے۔ انہوں نے اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی۔ انہوں نے سامنے کی یہ کھلی بات سمجھی بھی نہیں......وہ تو اس سے بہت سرسری انداز میں گزر گئے۔ استغفر اللہ۔ آدمی آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا ہوتا ہے۔ سامنے کی روشن اور بڑی چیز بھی اسے نظر نہیں آتی۔

اللہ جو بہت مہربان ہے، سکھایا اسی نے قرآن۔

بے شک ان کے دل نے پکارا، پھر دماغ نے اور پھر زبان نے کہا۔ بے شک اے اللہ، تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں یہ بہت بڑی نعمت، یہ ہدایت نامہ کامل و آخر عطا فرمایا۔

وہ غور کرنے لگے۔ کیسی بلیغ بات ہے۔ کس اختصار سے کہی گئی ہے کہ کھولنے بیٹھو تو دفتر کے دفتر بیان ہو جائیں۔ مہربان رب نے پیغمبر کو پیدا فرمایا۔ یہ بھی نعمت ہے جس کے شکر کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اللہ نے جبرئیل امین کے ذریعے اسے پیغمبر پر اتارا۔ آپؐ امی تھے۔ آپؐ کو پڑھایا۔ آپؐ کے ذریعے تشریح و تصریح فرمائی۔ آپؐ کی سیرت پاک کے ذریعے گمراہ اور جاہل انسانوں کو سکھایا، سبحان اللہ!

مرزا نے سوچا، اتنی مختصر سی آیت میں کتنی نعمتیں، کتنی عنایتیں ہیں جو مجھ کم فہم کو اللہ نے سمجھا دیں اور اللہ جانے کتنی ہزار، لاکھ نعمتیں، عنایتیں ہوں گی جو میں نہیں سمجھ سکا۔ جو سمجھ میں آیا، وہ کم تو نہیں۔ پیغمبرؐ وحی کلام پاک، اسے پڑھنا، اس پر عمل کرنا سکھانا..... سبحان اللہ!

یہ سوچ کر مرزا کے وجود میں شرمندگی ابھری۔ میں کہتا تھا کہ میں اللہ کا شکر گزار بندہ ہوں مگر میں نے اتنی عظیم نعمتوں پر، اتنی بڑی عنایتوں پر کبھی زبان سے بھی اس کا شکر ادا نہیں کیا۔ یہ شکر گزاری ہے؟ افسوس ہے تم پر مرزا.....

علما البیان، اس نے سکھایا بولنا۔

دوسرا دروازہ کھلا۔ مرزا اس میں داخل ہو گئے۔ دماغ میں، وجود میں روشنی کا سیلاب سا آ گیا۔ جو انہوں نے سمجھا، اسے سمجھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ پوری جان سے لرزنے لگے۔

واقعی مہربان رب نے بولنا سکھایا ورنہ انسان اشاروں میں باتیں کرتا۔ اسے بولنا نہ آتا تو ہدایت اس تک کیسے پہنچتی؟ وہ علم سے محروم رہتا۔ اچھا برا ایک دوسرے کو نہ سمجھا پاتا۔ ان کے لیے تو دوسروں تک عام سی بات پہنچانا بھی بہت مشکل ہوتا۔

ایک اور دروازہ کھلا۔

اللہ نے آدمی کو بولنا سکھایا مگر کیسے؟ ظاہر ہے القا کے ذریعے۔ وہ مہربان رب جو

پیغمبروں پر وحی اتارتا ہے، اپنے کسی بھی بندے پر کچھ بھی القا کر دیتا ہے۔ اس ذریعے سے وہ اپنے عام بندوں کو نوازتا رہتا ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو جو بھی سکھایا، وہ اسی ذریعے سے سکھایا۔

ایک اور دروازہ کھلا۔

ایک بولنا ہی کیا! انسانوں کو جو کچھ بھی آتا ہے، وہ انہیں ان کے رب نے سکھایا ہے۔ مختلف ذریعوں سے، کبھی براہ راست ان کے دل میں القا کر کے.... کسی خیال کے ذریعے۔ کبھی مظاہر فطرت کے ذریعے۔ کبھی مخلوق کے ذریعے اور کبھی اس کی اپنی جبلت کے ذریعے۔

مگر یہ جتنے بھی ذریعے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا محتاج نہیں ہے سکھانے میں۔ وہ چاہے تو کسی ذریعے، کسی سبب کو استعمال کر لے اور چاہے تو بغیر کسی ذریعے اور سبب کے جس مخلوق کو جو چاہے سکھا دے۔ آخر نوزائیدہ بچے کو ماں کا دودھ پینا کون سکھاتا ہے۔ یہ براہ راست اللہ ہی سکھاتے ہیں۔ ایک دن کا بچہ دوسرے بچوں کو دودھ چوستے دیکھ کر دودھ پینا تھوڑا ہی سیکھتا ہے۔

بعض عقل پرستوں، اندازے لگانے والوں نے ابتدائی دور کے انسان کے متعلق جو اندازے لگائے ہیں وہ کتنے بچگانہ ہیں۔ انہوں نے ابتدائی دور کے انسان کے متعلق اندازے قائم کیے ہیں کہ ابتداء میں وہ کیسا حیران ہوگا۔ اپنا گرد و پیش اسے کتنا وسیع، کتنا مہیب لگتا ہوگا اور اسے کچھ بھی نہیں آتا ہوگا۔ وہ ہر مخلوق سے ڈرتا ہوگا۔ پھر جب چھوٹے جانور اس سے ڈرے ہوں گے تو اسے اپنی طاقت کا کچھ ادراک ہوا ہوگا۔ ان کے خوف سے اس میں خود اعتمادی اور آگہی پیدا ہوئی ہوگی۔ یہ مجھ سے ڈرتے ہیں، گویا مجھے ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

پھر اسے بھوک لگی ہوگی۔ چرندوں کو کھاتے دیکھ کر اس نے گھاس اور پتے کھائے ہوں گے۔ بندروں نے اسے پھلوں سے روشناس کرایا ہوگا۔ درندوں کو دیکھ کر اسے پتہ چلا ہوگا کہ شکار کر کے بھی پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ اس پر پتھروں کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کا خیال القا ہوا ہوگا۔ ساتھ ہی اسے درندوں کے مقابلے میں اپنے تحفظ کی فکر لاحق ہوئی ہوگی اور جب وہ ان مرحلوں سے گزر گیا ہوگا تو اسے

اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ برتر مخلوق ہے۔ اپنے سے طاقت ور مخلوق کے مقابلے میں اپنا دفاع بھی کر سکتا ہے اور چاہے تو کوشش کرکے اسے زیر بھی کر سکتا ہے اور برتری اس بات کی ہے کہ اس کے پاس عقل ہے۔ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ اور پھر فیصلے پر عمل کر سکتا ہے۔

پھر تحفظ کی فکر نے اسے گھر کی ضرورت کا احساس دلایا ہو گا۔ یہ معاشرت کا نکتہ آغاز تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے زمین پر سونا خطرناک تھا۔ پہلے اس نے جانوروں سے غار میں رہنا سیکھا' پھر پرندوں سے گھر بنانا سیکھا۔ کوے سے اس نے زمین میں خود کو دفن کرنا سیکھا۔ جانوروں نے ہی اس کی جنس کی جبلت کو جگایا ہو گا۔ یوں نسل کی افزائش شروع ہوئی ہو گی۔

یہ سب عقل کے گھوڑے دوڑانے والوں کی باتیں ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ سب کچھ اللہ نے انسان کو سکھایا۔ ذریعہ کس کو بنایا؟ یا بغیر کسی ذریعے کے سکھایا یہ وہی جانتا ہے۔

اب جدید دور ہے۔ ایجادات کا دور اور ایجاد کیسے ہوئی؟ اللہ نے سکھایا۔ دل پر خیال اترا۔ خیال سے پہلے مشاہدہ اور تجربہ موجود تھا۔ خیال کو تجربے کی کسوٹی پر رکھا اور اللہ کی رہنمائی میں کوئی چیز ظہور میں آ گئی۔

تو خیال بڑی طاقت ہے۔ بہت بڑی مگر بنیادی بات زبان ہے۔ لفظ ہیں' وہ نہ ہوتے تو ابلاغ نہ ہوتا۔ چراغ سے چراغ نہ جلتا۔ تاریکی رہتی' روشنی نہ ہوتی۔ اللہ نے بولنا سکھایا' بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔ زبان سے انسان کی ترقی ہے۔ زبان سے علم کا پھیلاؤ ہے۔ زبان سے ہدایت کی روشنی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔

اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہے۔ انسان زمین پر اللہ کا نائب ہے۔ اللہ نے انسان کو سب کچھ سکھایا مگر اللہ کے ہاں پرفیکشن ہے اور بندوں کے ہاں نقص۔ اوپر آسمان پر بجٹ بنتا ہے۔ پتھر میں رہنے والے کیڑے کو بھی رزق ملتا ہے اور بجٹ میں خسارہ بھی۔ بندوں نے نظام تعزیر بھی بنایا ہے۔ پولیس بھی ہے' عدالت بھی اور سزا بھی مگر عدل خام بھی ہوتا ہے' گواہ جھوٹ بھی بول دیتے ہیں۔

تو اللہ نے انسان کو بولنا سکھایا.....اور بھی بہت کچھ......سب کچھ سکھایا۔

یہ سب سوچ کر مرزا لرز گئے۔ میں خود کو شکرگزار سمجھتا ہوں۔ میں بولتا ہوں' خوب باتیں کرتا ہوں۔ کبھی اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا کہ اس نے مجھے زبان دی اور لفظ دیئے۔ بولنا سکھایا ورنہ کتنی کٹھن ہوتی۔ اتنی بڑی نعمت پر کبھی شکر ادا نہ کرتا اور اس پر شکرگزاری کا غرہ! افسوس......صد افسوس!

مرزا کی سمجھ میں ایک اور نکتہ آیا۔ تو دنیا میں بولی جانے والی ہر زبان' ہر بولی اللہ کی عطا ہے تو ہر زبان محترم بھی ہوئی۔ آدمی کو کسی زبان سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ لفظوں کا احترام کرنا چاہیے۔ انہیں مقدس جاننا چاہیے۔ ہر لفظ' ہر زبان مقدس ہے۔

مرزا اور آگے بڑھے۔ ایک اور دروازہ کھلا!

الشمس والقمر بحسبان۔ سورج اور چاند پابند ہیں۔ ایک حساب کے۔

مرزا کی حیرت اور گہری ہو گئی۔

اللہ نے سورج اور چاند کو پابند کر دیا۔ کتنی بڑی عطا ہے۔ انسان کو نظام الاوقات عطا فرما دیا۔ سورج کہیں طلوع وہ رہا ہوتا ہے۔ کہیں نصف النہار پر ہوتا ہے۔ کہیں غروب ہو رہا ہوتا ہے اور کہیں اوجھل ہو رہا ہوتا ہے۔ جب سورج موجود ہو تو دن ہوتا ہے۔ غروب ہو جائے تو رات۔ رات کو اندھیرا ہوتا ہے۔ اندھیرا ہو تو نیند آتی ہے' روشنی سونے نہیں دیتی۔ کچھ کرنے پر اکساتی ہے۔ گویا نظام فطرت قائم ہو گیا۔ رات آرام کے لیے ہے اور آرام کتنی بڑی نعمت ہے۔ تھکن دور کرتا ہے۔ انسان کو تازہ اور چاق و چوبند کرتا ہے۔ دن کام کرنے کے لیے ہے اور آخرت کے لیے ہے۔ اچھے کام کرو اور آخرت میں جزا پاؤ۔ یہ نظام نہ ہوتا تو وقت ایک سا ہوتا۔ متعدد چھوٹی بڑی اکائیوں میں تقسیم نہ ہوتا۔ انسان منظم نہ ہوتا۔ وقت پر کھانے کی لذت سے بھی محروم ہو جاتا۔ کب نماز پڑھنی ہے' پتہ ہی نہ چلتا اور یکساں' مسلسل اور بے نظم زندگی بے کیف اور خشک ہوتی۔ اکتاہٹ سے مرجانے کو جی چاہتا۔

اللہ اکبر! میں خود کو شکرگزار کہتا اور سمجھتا ہوں۔ مرزا نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

اس روز ایک ایک آیت میں آگہی کے سینکڑوں دروازے کھلے۔ کچھ سمجھ میں آیا

مگر بیشتر سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی یہ فائدہ ہوا کہ مرزا پر فکر کے دروازے کھل گئے۔ وہ ہر چیز کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے۔ سوچنے لگے۔

ان دنوں مرزا کی عجیب کیفیت تھی۔ آئینہ دیکھا تو اپنے بارے میں سوچنے لگے۔

کیسا خوبصورت چہرہ ہے۔ دلکش نقوش ہیں۔ اللہ نے انہیں متناسب الاعضا بنایا ہے۔ انہوں نے اس پر کبھی شکر ادا نہیں کیا اس کا۔ تمام حسیں عطا فرمائیں درستی کے ساتھ۔ وہ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سونگھتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، ہاتھوں سے کام لیتے ہیں۔ کوئی محرومی نہیں مگر وہ کبھی شکر ادا نہیں کرتے۔ ہاں، داڑھ میں درد ہو جائے تو تڑپتے ہیں۔ اللہ سے گلہ کرتے ہیں۔ یہ ناشکرا پن نہیں تو کیا ہے۔

پھر انہیں اندر کے اعضاء کا خیال آگیا۔ دل ہے، پھیپھڑے ہیں، گردے ہیں، جگر ہے، مثانہ ہے، لبلبہ ہے، آنتیں ہیں۔ سب درست کام کرتے ہیں۔ لبلبہ کام کرنا چھوڑ دے تو شوگر ہو جاتی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے آدمی کھانے پینے سے محروم ہو جاتا ہے۔ تمام اعضاء کا یہی حال ہے۔ ہم اعضاء کی درستی پر تو شکر ادا نہیں کرتے۔ خرابی ہو جائے تو شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ نے آزمائش میں ڈال دیا۔ حالانکہ بے اعتدالیاں کرکے خرابی کا سامان ہم خود کرتے ہیں۔ یہ ناشکرا پن نہیں ہے؟

مرزا پوری جان سے لرز اٹھے۔ توبہ کرنے لگے۔ اللہ کا شکر ادا کرنے لگے۔

پھر ایک دن شہر کی واٹر سپلائی کی مین لائن پھٹ گئی۔ پانی کی قلت ہو گئی۔ چار دن پانی بند رہا۔ زندگی جیسے رک گئی۔ مرزا شکوہ کرنے لگے۔ شکوہ کرتے کرتے انہیں خیال آیا کہ پانی کتنی بڑی نعمت ہے مگر انہوں نے اس بات کو کبھی سمجھا نہیں تھا۔ اب محروم ہوئے تو پتہ چلا کہ پانی اللہ کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ہے۔ ہائے...... میں نے پانی جیسی نعمت پر بھی کبھی اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ لعنت ہے مجھ پر۔

ایک دن بے خبری اور لاعلمی کی ایک بے حد وسیع و عریض دنیا کا دروازہ مرزا کے لیے کھل گیا۔

اماں نے تین روز پہلے اعلان کر دیا تھا کہ جمعرات کو وہ ساجدہ کے ہاں جائیں گی۔ اماں کے لیے کہیں جانے کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ جانا چاہے ایک دن کے لیے ہو، اس کا اہتمام بہت لمبا ہوتا تھا۔ تین دن پہلے سے تیاری شروع ہوتی۔ کپڑے دھلتے،

استری کیے جاتے۔ اماں اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں یکجا کرتیں۔ پاندان دھو کر چمکایا جاتا۔ کلیاں چمکائی جاتیں۔ پھر ان میں کتھا چونا بھرا جاتا۔ پان، تمباکو کی معقول تعداد و مقدار کا اہتمام کیا جاتا۔ اماں کا گدا، تکیہ، چادر اور لحاف باندھے جاتے۔

اماں نے جو اعلان کیا تو مرزا کو اس کا علم نہیں تھا۔ اس بے خبری میں انہوں نے جو تیاریاں دیکھیں تو گھبرا گئے۔ "اماں...... خیر تو ہے؟"

"ہاں منے، سب خیر ہے۔"

"تو پھر یہ سب؟ آپ کہیں جا رہی ہیں؟" مرزا کو خیر کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"ارے...... ساجدہ کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"مرزا کا چہرہ فق ہو گیا۔ مجھے چھوڑ کر!" وہ گھبرا کر بولے۔ "کیوں اماں۔ ناراض ہو گئیں؟ کسی سے کوئی غلطی ہو گئی؟"

اماں ہنسنے لگیں۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس ملنے کو دل چاہ رہا ہے ساجدہ سے۔"

"تو پھر اتنی تیاری! مرزا نے بندھے ہوئے بستر اور گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ کئی مہینوں کے لیے جا رہی ہیں کیا؟"

"برسوں ہو گئے ہیں کہیں گئے ہوئے۔ اسی لیے تو بھول گیا ہے منے۔ میں تو ایسی ہی تیاری کرتی ہوں۔"

مرزا شرمندہ ہو گئے۔ واقعی، وہ یہ بات بھول گئے تھے۔ اماں سات برس بعد کہیں جا رہی تھیں۔ "پھر بھی...... واپس کب آئیں گی آپ؟" انہوں نے پوچھا۔

"ارے منے، کل جاؤں گی اور پرسوں واپس آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ مرزا نے سکون کی سانس لی۔"

اگلے روز گویا طبل جنگ بج گیا۔ تیاری مکمل ہونے کے بعد اماں ایک منٹ بھی صبر کرنے کی قائل نہیں تھیں۔ گیارہ بجے انہوں نے شور مچایا۔ منے..... جلدی سے ٹیکسی لے آؤ۔ مجھے چھوڑ کر آجانا۔

مرزا ٹیکسی لانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اماں کی ضعیفی کے پیش نظر جب ضرورت پڑتی تھی تو ٹیکسی اندر زینے تک لائی جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی

اسکوائر کے باہر ہی کھڑی مل گئی۔ مرزا کی نظر پہلے اس کی نمبر پلیٹ پر پڑی ..... JL-787 ارے .....انہوں نے سوچا۔ ایک نمبر کم ہوتا تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کا عدد ہو جاتا۔ بہرکیف انہوں نے ٹیکسی والے سے بات کی اور اسے اندر لے آئے۔

اماں کا سامان نیچے پہنچانے اور اماں کو نیچے لانے کی غرض سے وہ اوپر آئے تو صورتحال بدل چکی تھی۔ باتھ روم کے دروازے کی چوکھٹ سے اماں کو ٹھوکر لگی تھی۔ بائیں پیر کا انگوٹھا نیلا ہو گیا تھا۔ سوجن بھی بہت تھی۔ اماں سے ٹھیک طرح سے کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا مگر وہ اب بھی جانے پر تلی ہوئی تھیں۔ "مجھے کون سا چلنا ہے۔" وہ نجمہ بیگم سے کہہ رہی تھیں۔ لیٹی ہی تو رہوں گی۔

"نہیں اماں۔ تکلیف بڑھ بھی تو سکتی ہے۔" نجمہ بیگم نے کہا۔

"ارے بہو' اتنی تیاری کی ہے میں نے۔"

"کچھ بھی ہو' میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔" نجمہ بیگم نے زور دے کر کہا۔

"تم خواخواہ پریشان ہوتی ہو۔"

"بس اماں۔ یہ بات تو ماننی پڑے گی آپ کو۔"

مرزا نیچے موجود ٹیکسی کی طرف سے فکرمند تھے۔ وہ بیوی سے بولے۔ "جانتی ہو کہ اماں ارادہ کرلیتی ہیں تو وہ ٹلتا نہیں۔ چلی جائیں گی۔"

"ایسے کیسے چلی جائیں گی' اتنی تکلیف میں۔" نجمہ بیگم نے بگڑ کر کہا۔

مرزا نے بے بسی سے اماں کی طرف دیکھا۔ اماں نے برسوں کی خدمت گزار اور فرمانبردار بہو کی خاطر ایثار کا مظاہرہ کیا ورنہ وہ یوں آسانی سے ارادہ بدلنے والی نہیں تھیں۔ "ٹھیک ہے منے۔ دو چار دن بعد سہی' تم ٹیکسی واپس کر دو۔"

مرزا نیچے گئے۔ انہوں نے ٹیکسی والے سے معذرت کی اور اسے بیس روپے دے کر رخصت کردیا مگر وہ بیس روپے بلا وجہ خرچ کرنا انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔ دن بھر ان کا موڈ خراب رہا۔ ادھر اماں بھی دن بھی بڑبڑاتی رہیں۔ "یہ منحوس ٹھوکر بھی آج ہی لگنی تھی۔ پروگرام خراب کر دیا میرا۔"

اگلے روز اخبار پڑھتے ہوئے ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اخبار میں ایک دردناک حادثے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ عائشہ منزل کے قریب ایک بڑے ٹرالر نے

ایک ٹیکسی کو ٹکرمار دی۔ ٹیکسی کے مسافروں میں سے دو تو موقع پر جاں بحق ہو گئے تھے۔ ایک اسپتال پہنچ کر ختم ہو گیا تھا۔ ایک کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی حالت نازک تھی۔ حادثہ گیارہ بج کر بیس منٹ پر ہوا تھا۔

تفصیلی خبر پڑھ کر مرزا کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ خبر کے ساتھ تباہ شدہ ٹیکسی اور زخمی ڈرائیور کی تصویریں بھی تھیں۔ مرزا نے دونوں کو پہچان لیا۔ ٹیکسی کی نمبر پلیٹ تصویر میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ نمبر تو وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے تھے..... JL-787 اور ٹیکسی کا نمبر خبر میں بھی موجود تھا۔ یہ وہی ٹیکسی تھی جسے انہوں نے کل بیس روپے دے کر واپس کیا تھا۔

صورت حال بالکل صاف اور واضح تھی۔ اللہ نے انہیں اور اماں کو بچا لیا تھا۔ اماں کو لگنے والی وہ ٹھوکر جسے وہ منحوس کہتی رہی تھیں' بہت مبارک تھی۔ وہ نہ لگتی تو وہ مرزا کے ساتھ پی آئی بی کالونی جاتیں۔ گیارہ بج کر بیس منٹ پر اس سڑک سے گزرتیں اور حادثے کا شکار ہو جاتیں۔ مرزا نے ٹیکسی کو گیارہ بج کر دس منٹ پر واپس کیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ ڈرائیور کو فوراً ہی سواری مل گئی تھی---- اور شاید اسی طرف کی۔

مرزا نے اس بارے میں اماں کو ایک ماہ بعد بتایا۔ اس وقت تو وہ گنگ بیٹھے سوچتے رہے۔ اگر ٹیکسی کا نمبر یاد رہ جانے والا نہ ہوتا تو انہیں معلوم بھی نہ ہوتا کہ مہربان رب نے ان پر عنایت فرمائی ہے۔ وہ نمبر شاید ان کی آنکھیں کھولنے کیلئے تھا۔

اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ پہلی بار انہیں پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی بے خبری میں بھی ان پر عنایات فرماتے ہیں۔ نجانے کب کب اور کہاں کہاں کن کن پریشانیوں اور مصیبتوں سے بندوں کو بچاتے ہیں اور بندوں کو ان کا پتہ ہی نہیں چل پاتا اور پتہ نہیں چل پائے تو شکر کیسے ادا کیا جا سکتا ہے۔ گویا ہر شخص پر اللہ کی کروڑوں عنایتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا اسے علم بھی نہیں ہوتا' لہٰذا وہ شکر بھی ادا نہیں کرپاتا۔

اور تم کہتے ہو کہ تم اللہ کے شکرگزار بندے ہو۔ مرزا نے خود کو ڈپٹا۔

ارے--- تم کیا شکر ادا کرو گے اپنے رب کی عنایتوں کا۔

سو مرزا اللہ کی نعمتوں اور عنایتوں پر غور و فکر کرتے رہے۔ بالآخر وہ ایک حتمی نتیجے پر پہنچ گئے۔ کوئی بندہ اللہ کی تمام نعمتوں کا' خود پر ہونے والی تمام عنایتوں اور احسانات کا شمار بھی نہیں کر سکتا۔ شکر ادا کرنا تو بالکل ناممکن ہے۔ کسی ایک احسان کے بھی شکر کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

بات ایک خود کار انداز میں ان کی سمجھ میں آ گئی۔ اتنے دنوں سے وہ نعمتیں شمار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں بس اتنا آ سکا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے اور وہ نعمتیں مادی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ اور ہر نعمت میں شکر کے بیشمار پہلو نکلتے ہیں۔

بڑی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے روحانی اور مادی اعتبار سے سب سے بڑی نعمتوں کو سمجھ لیا اور وہیں انہوں نے سمجھ لیا کہ شکر کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں' بندہ عاجزی کے اس احساس اور اظہار کے ساتھ شکر ادا کرتا رہے۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔

روحانی طور پر سب سے بڑی نعمت وحی اور اللہ کی سب سے بڑی عنایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت اور قرآن کریم ہے۔ جب کہ مادی اعتبار سے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہوا ہے۔

پہلے تو زندگی ہی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کے ساتھ بے شمار نعمتیں ہیں۔ صورت' جسم' اعضا۔ پھر حیات اور اس نعمت کا جاری و ساری ہونا ہوا کے سبب سے ہے۔ زندگی کیا ہے؟ سانس کی آمد و شد اور دل کا دھڑکنا۔ یعنی زندگی کیلئے ہوا ناگزیر ہے اور اللہ نے ہوا پر قدرت صرف اپنی رکھی۔ اس کو ہر طرف پھیلا دیا--- جاری فرما دیا۔ ہوا سب کیلئے ہے اور مفت ہے۔ اس کے حصول کیلئے جدوجہد نہیں کرنی پڑتی بلکہ ہر جدوجہد اسی کے دم سے ہے۔

اب کوئی صرف زندگی کا شکر ادا کرنا چاہے تو کیا کرے۔ پہلے تو زندگی پر اللہ کا شکر' جو کہ سانس کی آمد و شد اور دل کے دھڑکنے سے ہے--- پھر سانس پر اللہ کا شکر۔ اس پر تین شکر واجب ہوئے۔ پہلا یہ کہ اللہ نے ہوا جیسی نعمت عطا فرمائی۔ پھر

پھیپھڑوں کے ہوا قبول کرنے پر--- اور پھر ان کے سانس خارج کرنے پر اللہ کا شکر کہ یہ عمل رک جائے تو زندگی موت سے بدل جائے۔ پھر دل کے دھڑکنے پر اللہ کا شکر' جو کہ ایک منٹ میں 32 مرتبہ دھڑکتا ہے۔

اب ہر لمحہ ان چاروں پر شکر ادا کیا جائے جبکہ یہ عملاً ناممکن ہے۔ کوئی ایک شکر بھی ادا کیا جائے تو زندگی میں کچھ کرنے کی مہلت ہی نہ ملے اور ابھی بنیادی عناصر' پانی' آگ اور مٹی بھی باقی ہیں اور اس کے بعد وہ نعمتیں' وہ عنایتیں' جنہیں شمار کرنے میں عمر تمام ہو جائے اور ان کا شمار مکمل بھی نہ ہو۔ پھر وہ نعمتیں' وہ عنایتیں جن کے بارے میں انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ اسے ملیں' اس پر ہوئیں۔

اللہ اکبر! کوئی کیسے شکر ادا کرے۔ بندہ تو عاجز ہی ہے۔

مرزا کا وجود بے بسی اور عاجزی سے شل ہو گیا اور عجز اور بے بسی نے انہیں اللہ کی ایک اور عظیم نعمت' ایک بہت بڑی عنایت کا احساس دلایا--- سورۂ رحمٰن! اللہ نے اپنے عاجز' بے بس بندوں پر عنایت فرمائی۔ ان کیلئے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ انہیں سورۂ رحمٰن جیسی نعمت عطا فرما دی۔ جو اسے شکر ادا کرنے کی نیت سے پڑھ لے' وہ اپنے رب کی تمام نعمتوں' عنایتوں کا شکر ادا کر دے گا۔ سبحان اللہ!

پھر مرزا نے سورۂ رحمٰن یاد کر لی۔ اس روز کے بعد وہ جب بھی سورۂ رحمٰن پڑھتے' ایک مکمل عجز میں لپٹی شکر گزاری کے ساتھ پڑھتے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو ہچکیاں بندھ جاتیں اور یاد ہو جانے کے بعد تو یہ ان کا روز سوتے وقت کا معمول بن گیا۔

اس وقت بھی سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرتے وقت ان کی یہی کیفیت ہوئی۔ چوزی کبھی کبھی بطخ کے انداز میں بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر انہیں دیکھتا اور چند لمحے بعد سر جھکا لیتا مگر مرزا کو اس وقت کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔

تلاوت کر کے مرزا اٹھے۔ انہوں نے قرآن پاک کو چوم کر شیلف میں رکھ دیا۔ چوزی اب ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ ان کے پیروں سے بالکل چپک کر چلتا تھا۔ مرزا کو اس کے پیروں میں آ جانے کا خوف اتنا تھا کہ چوزوں کے آنے کے بعد سے ان کی چال بدل گئی تھی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے تھے۔

وہ عبادت کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئے تو پتہ چلا کہ بچے اسکول سے آ چکے ہیں۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلے آئے۔ چوزی بدستور ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ لیٹے تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ "ہر وقت مجھ سے چپکے رہتے ہو۔ اب جاؤ۔ گھومو پھرو چگو۔ دیکھو' بچے بھی اسکول سے واپس آ گئے ہیں۔" مرزا نے چوزی سے یوں کہا' جیسے وہ سب کچھ سمجھتا ہو۔

"میری محبت میں مجھ سے چپکے' بھوکے مرتے رہتے ہو۔ اسی لیے تو اتنے کمزور ہو۔" مرزا کے لہجے میں تاسف آ گیا۔ "مرغیوں کا پتہ ہے' ہر وقت چگتی پھرتی ہیں' پوٹا لٹکا رہتا ہے۔ ایک تم ہو۔ دادا سے کیا ملے گا تمہیں۔"

مگر چوزی ہلنے والا نہیں تھا۔

ادھر بچوں نے کپڑے بدلے' کھانا کھایا اور پھر باجماعت دادا کے کمرے کا رخ کیا۔ انہوں نے دادا کو سلام کیا۔ چوزی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دادا کی خیریت دریافت کی۔

"اللہ کا شکر ہے۔" مرزا نے کہا۔

"تو لیٹے کیوں ہیں؟" آفاق نے پوچھا۔

"نیچے چل کر کرکٹ نہیں کھیلیں گے۔" اشفاق بولا۔

"میری داڑھ میں درد ہے۔ رات کو سو نہیں سکا۔ اب نیند آ رہی ہے۔" مرزا نے کہا۔

"چھوڑیں نا دادا' کھیلنے چلیں۔" مشتاق اصرار کرنے لگا۔

"دادا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور آپ کو کھیلنے کی پڑی ہے۔" ننھی آمنہ نے بگڑ کر کہا۔ "ہٹیں آپ لوگ۔ میں دادا کا سر دباؤں گی۔"

مرزا کا دل محبت سے بھر گیا۔ بیٹی بیٹی ہی ہوتی ہے۔ فکر کرنے والی— خدمت گزار۔

آمنہ کی بات سن کر لڑکوں کو بھی غیرت آ گئی۔ "ہم بھی دادا کی خدمت کریں گے۔" انہوں نے بیک آواز کہا۔

اب اس پر جھگڑا ہونے لگا کہ دادا کے وجود کی مملکت کا کون سا صوبہ کس کو

ملے۔ مرزا نے ہی تصفیہ کرایا۔ "سر کی گورنر آمنہ ہے۔ سیدھی ٹانگ کا گورنر آفاق اور بائیں ٹانگ کا اشفاق ہے۔" انہوں نے اعلان کیا۔

"میرے لئے تو کچھ بچا ہی نہیں۔" مشتاق رونے لگا۔

"تم کمر پر چڑھ کر حکمرانی کرو۔"

چاروں بچے اپنے اپنے امور مملکت کی انجام دہی میں لگ گئے مگر یہ سرگرمیاں دیکھ کر چوزی نے شورش شروع کر دی۔ وہ کبھی ایک پر جھپٹتا اور کبھی دوسرے پر— اور ان کے متحرک ہاتھوں پر ٹھونگیں مارتا۔ چاروں بچوں پر برابر کے حملے کرنے کی کوشش میں وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔

اس وقت نجمہ بیگم کمرے میں آ گئیں اور یہ منظر دیکھ کر بہت ہنسیں۔ "لکھ لیں میری بات۔ یہ چوزی مرغی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔"

"ارے ایسی قابضانہ فطرت ہے اس کی۔ آپ کے قریب کسی کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

اسی لمحے اشفاق کے ذرا زور کی ٹھونگ لگ گئی۔ وہ بسورنے لگا۔ "بہت گندہ ہے یہ چوزی۔ دادا ہمارے ہیں اور یہ انہیں صرف اپنا سمجھتا ہے۔"

"دادا اس کے بھی تو ہیں۔" مشتاق نے اسے سمجھایا۔

چوزی کا اب بھی وہی عالم تھا۔ وہ چوکھی لڑ رہا تھا اور بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا' مرزا نے اسے ہاتھ میں پکڑا اور اپنے سینے پر رکھ لیا۔ "تم صدر مملکت ہو چوزی۔" انہوں نے محبت سے کہا۔ "میرا دارالخلافہ تمہارا ہے۔" انہوں نے تھپتھپایا۔

ان کے ہاتھ کا لمس پا کر چوزی پرسکون ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد مرزا نے بچوں سے کہا۔ "اب تم لوگ جا کر کھیلو۔ مجھے سونے دو۔ شام کو مجھے ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔"

جاتے جاتے بچوں نے چوزی کو بھی دعوت دی۔ "آؤ چوزی' چلیں۔"

چوزی مرزا کے ہاتھ پر چڑھا بیٹھا رہا۔ مشتاق نے کہا۔ "چوزی تو بس دادا کا بن گیا ہے ہمیں تو لفٹ ہی نہیں کراتا۔"

"یہ بات نہیں چوزی تم لوگوں کا بھی ہے بلکہ اصل میں تو تمہارا ہی ہے۔"

"تو پھر ہمارے ساتھ کھیلتا کیوں نہیں۔"

"تم لوگ اس سے پیار سے بات جو نہیں کرتے۔ اس کا خیال جو نہیں رکھتے پھر بھی یہ کھیلے گا تمہارے ساتھ۔" مرزا نے کہا۔ پھر چوزی کی طرف مڑے۔ "جاؤ چوزی ان کے ساتھ کھیلو جا کر۔"

مرزا نے تو یونہی کہا تھا مگر چوزی سچ مچ اٹھا اور بچوں کے ساتھ چل دیا۔

"دیکھا۔۔۔ چوزی دادا کی بات مانتا ہے۔" آمنہ نے معصومیت سے کہا۔

آفاق نے جاتے جاتے دروازے سے جھانک کر مرزا کو دیکھا اور بولا۔ "کچھ بھی ہو دادا' چوزی صرف آپ کا ہے۔" پھر وہ بھی چلا گیا۔

مرزا کے کانوں میں اس کی آواز گونجتی رہی۔ چوزی صرف آپ کا ہے۔ چوزی۔۔۔

کیا واقعی؟ مرزا نے خود سے پوچھا۔ چوزی تو ان بچوں کا تھا۔ پھر میرا ہو گیا۔۔۔ کیسے۔۔۔ نجانے کیسے؟ اب تو یاد کرنا بھی مشکل ہے۔

مگر پھر انہیں سب کچھ یاد آنے لگا!

○

پچھلے دونوں چوزے نیم مرغیانہ صورت میں سجو آپا کے گھر بھیج دیئے گئے تو چوزی کی ان کے گھر میں انٹری ہوئی اور چوزی اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اس جیسے تین اور بھی تھے۔ خرید کر لانے والے اس بار بھی مرزا ہی تھے۔

مرغی نما چوزوں کے بھیجے جاتے ہی بچوں نے نئے چوزوں کا تقاضا شروع کر دیا۔ بالآخر بدھ کے روز مرزا انہیں بازار لے گئے۔ چوزوں والی سے انہوں نے مختلف رنگوں کے چار چوزے لئے۔ ہر بچے کی پسند کے مطابق مگر مرزا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ چاروں چوزے غیر معمولی حد تک چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی ابھی انڈے سے نکلے ہیں بلکہ مرزا کو تو یقین تھا کہ اگر انہیں دوبارہ انڈوں میں فٹ کیا جائے تو انہیں بغیر کسی دشواری کے دوبارہ انڈوں میں بند کیا جا سکتا ہے۔

"یہ تو بہت چھوٹے ہیں۔ بہت نازک لگ رہے ہیں۔" مرزا نے کہا۔

"بالکل نئے ہیں بابو جی اور یہ مشین سے نہیں نکلے ہیں بطخ کے نیچے سے نکلے ہیں۔" چوزوں والی بولی۔

مرزا نے چوزوں کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا مگر انہیں ان میں بطخ والی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ بس خاص بات یہی تھی کہ وہ بہت چھوٹے تھے۔ اتنے چھوٹے چوزے انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ "یہ تو مرجائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"تو دوسرے لے لیں۔"

لیکن بچوں کو وہی چوزے پسند آ گئے تھے۔ وہ دوسرے چوزے لینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ چنانچہ وہی چوزے لینے پڑے۔ چوزے گھر آ گئے۔

مرزا کے منہ سے جانے کس لمحے میں بات نکلی تھی کہ پوری ہو گئی۔ اگلی صبح

بچوں نے چوزوں کو کھولنے کیلئے پنجرے کا دروازہ کھولا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ دو چوزے مرچکے تھے۔ معاہدے کے مطابق مزید چوزے خریدنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ اب ایک چوزہ مشتاق اور اشفاق کا ہوگیا اور دوسرا آفاق اور آمنہ کا۔ مگر اگلے روز ایک اور چوزہ ختم ہوگیا۔

جو چوزہ زندہ بچا وہ چوزی تھا۔

اب چوزی چاروں بچوں کا مشترکہ چوزہ تھا لیکن ہوا یہ کہ بچوں کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ ادھر وہ اکیلا چوزہ جبکہ چوزے تنہائی کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ لیکن بچے نہ یہ بات جانتے تھے' نہ انہیں اس کی پروا تھی۔ ان کا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔

پھر ہوا یہ کہ دو دن بعد بچوں کی موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو گئیں۔ ادھر 11 جون کو ثمینہ اور روبینہ کی سب سے چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ چنانچہ دونوں بچوں کو لے کر اپنی امی کے گھر چلی گئیں۔ اماں ان سے پہلے سجو آپا کے ہاں جا چکی تھیں۔ گھر میں بس مرزا صاحب اور نجمہ بیگم رہ گئے۔

پہلی رات دونوں کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ کیسا سناٹا تھا۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ ان سے ایک دوسرے سے بھی زیادہ بات نہیں کی گئی۔ عجیب حال تھا۔ انہوں نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔ مگر دیکھ نہیں رہے تھے۔ اس سے بس اتنا ہوا کہ گھر آوازوں سے بھر گیا۔

دونوں بہت دیر سے سوئے۔ مرزا تو معمول کے مطابق فجر کے وقت اٹھ گئے۔ نجمہ بیگم سوتی رہیں۔ مرزا نے انہیں اٹھایا بھی نہیں۔ کسی سوتے ہوئے کو جگانے کا انہیں حوصلہ ہوتا بھی نہیں تھا۔ یہ ان کی کمزوری تھی۔

نماز پڑھ کر مرزا ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے۔ چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی لیکن نہ وہ چائے بنا سکتے تھے اور نہ ہی نجمہ بیگم کو جگا سکتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے انہیں گھبراہٹ ہونے لگی روز گھر میں کیسی رونق ہوتی تھی اور آج کیسا سناٹا ہے۔ کیسی تنہائی ہے۔ سچ تو ہے' گھر تو لوگوں کے دم سے ہوتا ہے۔ صرف درودیوار سے گھر کہاں بنتے ہیں۔

اچانک ایک مسلسل آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ چوزے کی آواز تھی۔ اور وہ مخصوص آواز پچھلے چوزوں کے حوالے سے وہ خوب پہچانتے تھے۔ انہیں یاد آ گیا پچھلی

بار چوزوں کو دیکھ کر انہوں نے کہا تھا۔ "ارے--- یہ تو بہت سوشل ہوتے ہیں۔ اکیلے پن سے گھبراتے ہیں۔"

"ہاں منے--- یہی وجہ ہے کہ اکیلا چوزہ کبھی نہیں پلتا۔ مرجاتا ہے۔" اماں نے تائید کی تھی۔

مرزا نے مشاہدہ کیا تھا کہ چوزے ساتھ رہتے' ساتھ پھرتے تھے۔ ایک ہی چیز پر چونچ مارنے کے چکر میں لڑتے تھے مگر ساتھ نہیں چھوڑتے تھے ایک دوسرے کا۔ رات کو سوتے بھی تو ایک دوسرے سے ٹیک لگا کر' لپٹ کر۔ اس طرح کہ الگ الگ شناخت کرنا بھی ناممکن ہوتا اور اگر کوئی اکیلا رہ جاتا تو مخصوص آواز میں زور زور سے چیختا اس آواز میں گھبراہٹ ہوتی' پکار ہوتی۔ التجا ہوتی' جیسے کہہ رہا ہو میں اکیلا ہوں تم سب کہاں ہو۔ آواز دو مجھے یا آ کر لے جاؤ اور جب تک وہ دوسروں سے نہ جا ملتا اسی آواز میں چیختا رہتا۔

اس لمحے سے پہلے مرزا کو اندازہ نہیں تھا کہ پچھلے چوزوں کے تجربے اور مشاہدے ان کے اندر موجود ہیں۔ بس شعور کی سطح تک نہیں آ پائے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے تنہا چوزے کی آواز' پکار اور التجا کو پہچان لیا۔ اس آواز نے پہلے انہیں چونکایا اور اگلے ہی لمحے تڑپا ڈالا۔ شاید اس لئے بھی کہ اس لمحے وہ خود بھی اس کرب سے گزر رہے تھے۔ وہ تو خود تنہائی کے دشت بے کراں میں پریشان کھڑے تھے۔

اس سے پہلے انہیں اس چوزے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے کہ اسے وہ محض پوتوں کی خاطر برداشت کر رہے تھے۔ انہیں چوزوں سے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں مگر اس وقت تنہائی کے اس نوحے نے ان کے دل کو چھو لیا۔ وہ تڑپ کر اٹھے اور اماں کے کمرے میں چلے گئے۔ پنجرہ اس سے متصل گیلری میں رکھا تھا۔

"ارے ننھے سے بچے' تم بھی ہماری طرح اکیلے ہو۔ تمہارا بھی دل ہماری طرح گھبرا رہا ہے۔" وہ بڑبڑائے۔ "مگر ہم آزاد ہیں جبکہ تم قید بھی ہو۔" یہ کہہ کر انہوں نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا پھر اس کی طرف دیکھے بغیر وہ لاؤنج کی طرف واپس چل دیئے۔

چوزہ بے تابی سے باہر نکلا پھر وہ جیسے ان کے قدموں سے بندھ گیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ "بھوکے بھی معلوم ہوتے ہو۔" انہوں نے کہا پھر کچن سے تھوڑا سا باجرہ لا کر فرش پر پھیلا دیا اور خود گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

چوزہ چند لمحے چگتا رہا پھر باجرہ چھوڑ کر ان کے قریب۔۔۔ بہت قریب آ گیا۔ اگلے ہی لمحے ان سے جڑ کر بطخ کے سے انداز میں یوں بیٹھ گیا' جیسے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر رہا ہو۔

مرزا اپنی سوچوں میں گم ہو گئے۔ زندگی میں کبھی وہ اس طرح تنہا نہیں ہوئے تھے مگر یہ ان کی اپنی قبول کی ہوئی تنہائی تھی۔ دونوں بیٹے سسرال نہیں جانا چاہتے تھے لیکن بہوؤں کی دل جوئی کی خاطر انہوں نے حکماً انہیں ان کے ساتھ بھیجا تھا۔

سرسراہٹ سے وہ چونکے دیکھا تو چوزہ ان کے کپڑوں کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "تم مجھے اپنی ماں تو نہیں سمجھ رہے ہو؟" مرزا نے ہنستے ہوئے کہا اور پیار سے اس کی پشت سہلانے لگے۔

وہ پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گئے۔ درمیان میں انہوں نے چوزے کو دیکھا وہ ان سے چپک کر سو رہا تھا۔ اماں کہتی تھیں۔۔۔ چوزے گرمی تلاش کرتے ہیں اس کے بغیر نہیں رہ سکتے اور مرغی کے پروں میں بہت گرمی ہوتی ہے۔ یعنی چوزہ ان میں ماں کی گرمی تلاش کر رہا تھا۔

ذرا دیر بعد گھنٹی بجی۔ وہ دروازہ کھولنے کیلئے اٹھے۔ گہری نیند سوتا ہوا چوزہ اٹھ کر ان کے ساتھ لپکا۔ دروازے پر چوکیدار تھا۔ "آپ کو اشرف آواز دے رہا ہے۔" اس نے بتایا۔

وہ سیڑھی اتر کر ریلنگ کی طرف گئے وہاں گوشت والا اشرف اور سبزی والا رشید کھڑے تھے۔ "کیا بات ہے اشرف؟" انہوں نے پوچھا۔

"آفتاب بھائی کہہ کر گئے تھے کہ آپ اکیلے ہیں آپ کا خیال رکھو۔" اشرف نے کہا۔ "بابو جی' کوئی بھی ضرورت ہو تو مجھے یا رشید کو آواز دے لیجئے گا۔" انہوں نے سبزی والے کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت شکریہ بیٹے۔" مرزا صاحب نے شکر گزاری سے کہا۔ آج کل بھی لوگ اس طرح خیال رکھتے ہیں۔

گھر میں واپس آتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ چوزہ ان کے ساتھ لگا ہوا باہر آ گیا تھا۔ "کیا بات ہے میاں چوزی؟ میرے پیچھے کیوں لگے ہو؟" انہوں نے پہلی بار اسے چوزی کا خطاب دیا۔

پھر یہ چیک کرنے کیلئے کہ چوزہ واقعی ان کے پیچھے لگا ہوا ہے' وہ پورے گھر میں پھرتے پھرے۔ چوزہ ان کے ساتھ لگا رہا۔ "یہ تو بڑی مشکل ہو جائے گی چوزی میاں۔" وہ بولے۔ "بے دھیانی میں تو تم پاؤں کے نیچے بھی آ سکتے ہو اتنے سے تو ہو پچک جاؤ گے۔"

پھر وہ اسے پیچھے لگا کر باتھ روم میں لے گئے اور وہاں سے ایک دم تیزی سے بھاگ آئے۔ چوزہ اس وقت سنک کے نیچے کسی جستجو میں مصروف تھا۔ مرزا لاؤنج میں آئے اور گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

اگلے ہی لمحے انہیں چوزے کی مخصوص گھبرائی ہوئی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ بہت بلند' فریاد کی سی آواز تھی۔ پچھلی آواز سے زیادہ بلند آہنگ۔ انہیں چوزے پر ترس آنے لگا۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ چوزے نے انہیں اپنا سب کچھ مان لیا ہے۔ وہ اس کیلئے چوزہ بھی ہیں' مرغی بھی اور مہربان مالک بھی۔

صرف چند لمحوں میں وہ آواز اور دردناک ہو گئی۔ وہ باتھ روم کی طرف لپکے انہیں دیکھتے ہی چوزہ خاموش ہو گیا اور ان کی طرف لپک آیا۔ وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھے چوزہ پھر ویسے ہی بیٹھ کر سو گیا۔

دیر ہو گئی مرزا جب بھی اٹھے چوزہ ان کے پیچھے چلتا رہا۔ "تم تو یار میری دم بن گئے ہو۔" مرزا بڑبڑائے۔

پھر مرزا نے ایک عجیب منظر دیکھا چوزہ اتنا چھوٹا تھا کہ پنکھے کی ہوا سے ہلتا تھا۔ بہت ہی نازک تھا وہ اور جب تک وہ بیٹھے رہے وہ سوتا رہا۔ "یار چوزی' جانور تو فطرت سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ وقت پر سوتے' وقت پر جاگتے ہیں تم بے وقت کیوں سو رہے ہو؟" انہوں نے سوتے ہوئے چوزے سے پوچھا۔

چوزہ بے خبر سوتا رہا۔

گیارہ بجے نجمہ بیگم بیدار ہوئیں۔ انہوں نے مرزا سے شکایت کی کہ انہوں نے انہیں جگایا کیوں نہیں۔ "بیٹھے چائے کو ترس رہے ہوں گے۔" انہوں نے کہا۔

"ہاں' یہ تو ہے۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں تمہیں جگا نہیں سکتا۔"

"اور اتنی دیر سے اکیلے بور ہو رہے ہوں گے۔"

مرزا اس کی تائید کرنا چاہتے تھے مگر انہیں خیال آیا کہ یہ تو سچ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں احساس ہوا کہ معاملہ یک طرفہ نہیں انہوں نے چوزے کی تنہائی دور کی تو چوزے نے بھی ان کی تنہائی دور کی۔ وہ نہ ہوتا تو وہ واقعی اب تک اکتا چکے ہوتے۔ "پتہ ہے' مجھے اس بے چارے پر اتنا ترس آیا۔ اکیلا چیخ رہا تھا۔ انہوں نے سوتے ہوئے--- چوزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چوزے اکیلے ہوں تو نہیں جیتے۔"

"مگر اور چوزے نہ لے آیئے گا۔"

مرزا کو اب تشویش ہونے لگی۔ "یہ بیمار تو نہیں' سست ہو رہا ہے سوئے جا رہا ہے۔"

"یہی بات ہو گی۔" نجمہ بیگم نے کہا۔ "ویسے چوزے دن میں سوتے تو نہیں ہیں۔"

مرزا پریشان ہو گئے مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ وہ دل میں اس چوزے کی زندگی کیلئے دعا کرتے رہے۔ ذرا دیر میں انہیں اس سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ پورا دن اسی انداز میں گزرا۔ چوزے نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ جہاں جاتے' چوزہ ان کے پیچھے ہوتا۔ وہ ان کے پیچھے عبادت کے کمرے میں بھی چلا آیا۔

"اب اسے بند بھی کر دیجئے۔" نجمہ بیگم نے کہا۔

مرزا نے ایک بار چوزے کو بند کیا مگر وہ اکیلے پن سے گھبرا کر چیخنے لگا۔ مرزا سے برداشت نہیں ہوا۔ انہوں نے اسے کھول دیا۔ وہ پہلا چوزہ تھا' جو دن بھر کھلا رہا تھا۔

ایک بار مرزا کسی کام سے نیچے گئے۔ چوزہ دروازے کے باہر تک ان کے پیچھے گیا مگر پھر واپس چلا گیا۔ مرزا لوٹے تو نجمہ بیگم نے کہا۔ "یہ تو عجیب چوزہ ہے آپ

کے جانے کے بعد میرے پیچھے لگا رہا۔ جہاں میں جاتی تھی' میرے پیچھے جاتا تھا۔"

"ہاں۔ بات یہ ہے کہ اس کے ساتھی' اس کے مونس و غم خوار ہمی ہیں۔" مرزا نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں نہیں ہوں۔ آپ ہی ہوں گے۔"

رات کو انہوں نے اسے پنجرے میں بند کر دیا اور لائٹ آف کر دی۔ گیلری کا دروازہ بند کر کے وہ اندر چلے آئے۔ اب پھر وہی تنہائی تھی اور وہی اکتاہٹ۔ انہوں نے پھر ٹی وی لگا دیا۔ کچھ دیر وہ نجمہ سے باتیں کرتے رہے مگر پھر بات کرنے کو بھی تنہائی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ دونوں سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ انہوں نے جھنجلا کر ٹی وی بند کر دیا۔ عجیب بات ہوئی تھی۔ انہوں نے خاموشی دور کرنے کیلئے ٹی لگایا تھا لیکن ٹی وی کی آوازیں گھر کی ویرانی اور سناٹے کو اور زیادہ اجاگر کر رہی تھیں۔ تنہائی کا احساس اور بڑھ گیا تھا۔

وہ نجمہ بیگم سے بچوں کے متعلق باتیں کرتے رہے پھر اچانک انہوں نے سر ایک طرف جھکا کر سماعت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اب کان بھی بجنے لگے میرے۔"

"کیا ہوا؟" نجمہ بیگم نے پوچھا۔

"مجھے چوزے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ جیسے وہ گھبرا کر چیخ رہا ہو۔"

"اسے تو سو جانا چاہئے تھا چل کر دیکھیں تو۔"

وہ دونوں اماں کے کمرے میں داخل ہوئے تو چوزے کی آواز بالکل واضح ہو چکی تھی۔ انہوں نے کمرے کی اور پھر گیلری کی لائٹ آن کی اور گیلری کا دروازہ کھولا۔

چوزہ انہیں دیکھتے ہی یک لخت خاموش ہو گیا۔ پھر وہ بے تابی سے پنجرے کے دروازے کی طرف لپکا۔ اگلے ہی لمحے اس نے دروازے پر چونچیں مارنی شروع کر دیں۔

"کھول دیجئے اسے۔" نجمہ بیگم نے کہا۔

مرزا نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چوزہ باہر نکل آیا مگر ادھر ادھر بھاگنے کے بجائے وہ ان کے پیروں کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ مرزا نجمہ بیگم کے ساتھ لاؤنج کی طرف چلے تو چوزہ بھی ان کی ایڑیوں سے چپک کر ان کی رفتار سے چلتا رہا۔ مرزا بیٹھے تو وہ ان کے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مسئلہ کیا ہے اس کے ساتھ۔" مرزا نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ سوتا کیوں نہیں؟"

نجمہ بیگم چوزے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "یہ سونا چاہتا ہے مگر ایسے سو نہیں سکتا۔" وہ بولیں۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"ادھر دیکھیں۔۔۔" نجمہ بیگم نے کہا اور چوزے کو اٹھا کر دونوں ہاتھ میں بند کر

لیا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ پوری طرح ان کی ہتھیلیوں کے انڈے میں بند ہو گیا۔

"کیا کرتی ہو۔ دم گھٹ جائے گا اس کا۔" مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ دیکھتے رہیے۔"

نجمہ بیگم نے کوئی پانچ منٹ چوزے کو اسی طرح بند رکھا اس دوران مرزا گھبراتے رہے۔ "اب دیکھئے۔" نجمہ بیگم نے کہا۔

مرزا ان کے قریب ہو گئے۔ نجمہ بیگم نے اوپر والی ہتھیلی اٹھائی چوزہ نیچے والی ہتھیلی کے پیالے میں بیٹھا سکون سے سو رہا تھا لیکن اوپر کا ہاتھ ہٹتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "کچھ سمجھے آپ؟" نجمہ بیگم نے پوچھا۔

مرزا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مرغی چوزوں کو اپنے پروں میں چھپا کر سلاتی ہے۔" نجمہ بیگم نے کہا۔ "یعنی اندھیرا ہو' نرم گداز اور گرم لمس میسر ہو تو یہ سوتے ہیں۔ اس پنجرے میں اس بے چارے کو اندھیرے کے سوا کچھ بھی میسر نہیں اور اندھیرا بھی مکمل نہیں۔"

مرزا چند لمحے اس پر غور کرتے رہے۔ پھر بولے۔ "لیکن ہمارے گھر میں چوزے مرغی کے بغیر سوتے رہے ہیں۔"

"تب وہ ایک دوسرے سے لپٹ جاتے تھے مگر یہ بے چارہ تو اکیلا رہ گیا ہے۔"

نجمہ بیگم نے کہا۔ پھر ایک دم وہ چونکیں۔ "ارے۔۔۔ اسی لئے تو یہ دن بھر ست رہا ہے جب موقع ملتا تھا' سو جاتا تھا۔ جب سے اکیلا ہوا ہے' یہ سویا ہی نہیں ہو گا۔"

مرزا کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ "کیسا ظلم ہوا ہے اس کے ساتھ۔ اللہ ہمیں معاف کرے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا مگر اب کیا ہو۔"

"آپ اسے اپنے ساتھ سلا لیں۔"

"کیسے؟"

"ابھی دکھاتی ہوں۔"

مرزا کو ابتدا ہی سے فرش پر سونا پسند تھا۔ نجمہ بیگم نے بستر بچھا دیا پھر انہوں نے لائٹ آف کر دی۔ "اب آپ لیٹ جائیے۔"

مرزا بستر پر دراز ہو گئے۔

"اب آپ اسے پہلو سے لگا لیجئے اپنا ہاتھ اس پر رکھ دیجئے یہ سو جائے گا۔"
یہ ترکیب آزمائی گئی۔ چوزہ فوراً ہی سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مرزا نے ہاتھ ہٹا لیا مگر چوزہ نہیں جاگا۔ وہ ان کے پہلو سے چپکا بے خبر سوتا رہا لیکن مرزا فکر مند ہو گئے۔ "یہ بات تو چلنے والی نہیں۔ سوتے میں ذرا بھی میں ادھر ادھر ہوا تو چوزہ پچک جائے گا۔ خیال رکھوں گا تو میں رات بھر نہیں سو سکوں گا۔"

"یہ بات تو ہے۔" نجمہ بیگم نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "خیر--- میں کوئی ترکیب سوچتی ہوں۔"

"بالآخر ایک آئیڈیا ان کے ذہن میں آ گیا۔ کمرے میں بیڈ خالی پڑا رہتا تھا۔ اس پر کوئی سوتا نہیں تھا۔ گدا فوم کا تھا' جس میں گرمی بہت ہوتی ہے پھر وہ ڈرائنگ روم سے تین کشن اٹھا لائیں۔ انہوں نے ایک بوسیدہ سی پرانی چادر ڈھونڈ کر نکالی پھر بڑا فلور کشن لا کر بیڈ پر رکھا۔

مرزا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

نجمہ بیگم نے چادر کو تہ کر کے فلور کشن پر رکھ دیا۔ "یہ ہو گیا آپ کے چوزی کا بستر۔" وہ بولیں۔ "اور یہ چادر اب چوزی کی ہو گئی۔"

"لیکن کیوں؟"

"بھئی--- یہ بیٹ تو کرے گا۔ یوں کشن بھی خراب نہیں ہو گا اور چادر دھل جایا کرے گی۔"

مرزا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی چوزہ ان کے پہلو کی گرمی سے محروم ہوا' اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ چوں چوں کرنے لگا۔

"فکر نہ کرو چوزی۔ دادی نے تمہارے سونے کا بندوبست کر دیا ہے۔" انہوں نے بے حد محبت سے کہا اور بڑی نرمی سے اسے پکڑ لیا۔ پھر انہوں نے اسے لے جا کر کشن پر رکھ دیا۔ "اب سو جاؤ آرام سے۔"

لیکن چوزہ فوراً ہی کشن سے اتر کر ان کے ہاتھ کی طرف آ گیا۔ اب اس کی چوں چوں میں بے تابی تھی۔ "یہ تو نہیں سو رہا ہے۔" مرزا نے مایوسی سے کہا۔

"ایسے تھوڑا ہی سوئے گا۔" نجمہ بیگم نے کہا اور چوزے کو فلور کشن پر رکھ کر

ایک چھوٹا کشن اس کے اوپر ڈال دیا۔ اس کے بعد دو کشن یوں کھڑے کر دیئے' جیسے اہرام مصر تعمیر کر رہی ہوں۔ "اب یہ سو جائے گا۔"

"دب کر مر جائے گا۔ دم گھٹنے سے مر جائے گا۔" مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"جی نہیں۔ اوپر پڑے کشن کے لمس کی وجہ سے ہی یہ سوئے گا۔"

"اور نکلے گا کیسے؟"

"دیکھ لیجئے گا۔"

"چوزہ اب بھی چوں چوں کر رہا تھا۔ مرزا نے سوچا' نجمہ بیگم کا اندازہ غلط تھا۔ وہ یہ بات کہنے ہی والے تھے کہ چوزے کی آواز غنودگی میں ڈوبنے لگی اور چند لمحوں میں گم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

مرزا سونے کیلئے لیٹ گئے لیکن انہیں یہ ڈر تھا کہ چوزہ صبح تک دبنے سے یا دم گھٹنے سے مر چکا ہو گا۔ پھر نیند نے انہیں ہر فکر سے بے نیاز کر دیا۔

صبح وہ معمول کے مطابق اٹھے۔ انہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ لیکن باتھ روم سے وضو کر کے نکلتے ہی ان کی نظر بیڈ پر پڑی۔ چوزی کا اہرام نما بستر نظر آیا تو فکر مند ہو گئے۔ پتہ نہیں' چوزہ زندہ بھی ہو گا یا نہیں؟

اگلے ہی لمحے انہیں اس کا جواب مل گیا۔ اہرام سے چوزی باہر نکلا وہ پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے پرواز کرنے والا ہو لیکن بیڈ کے کنارے تک آ کر وہ ٹھٹک گیا۔ جبلت نے اسے بتا دیا کہ یہ چھلانگ خطرناک ہے۔ "تم وہیں رہو مجھے نماز پڑھنے دو۔" مرزا نے کہا۔

لیکن جیسے ہی وہ کمرے سے نکلے' چوزی نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا--- اسی مخصوص گھبرائی ہوئی آواز میں۔ وہ اکیلا چھوڑے جانے پر پریشان تھا۔ اکیلا تو نہیں ہے مرزا نے خود کلامی کی۔ ہماری بیگم بھی تو وہیں سو رہی ہیں۔ وہ عبادت کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

مگر چوزی کی آواز ان کا پیچھا کرتی رہی۔ اس کی تڑپ نے انہیں عبادت کے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آئے اور چوزی کو بیڈ سے اتار کر فرش پر چھوڑ دیا۔ "چلو جاؤ عیش کرو۔"

چوزی کا عیش شاید یہی تھا کہ وہ ان کے پیچھے لگا رہے۔ وہ عبادت کے کمرے میں ان کے ساتھ چلا آیا۔

وہ نیا معمول تھا' جو شروع ہوا۔ اب روز یہی کچھ ہوتا۔ دس روز بعد ایک تبدیلی آئی۔ اب چوزی پہلے جاگتا تھا۔ وہ چھلانگ مار کر بیڈ سے اترتا اور مرزا کے کان میں چونچ سے گدگدی کر کے انہیں جگاتا اور وہ ٹھیک فجر کے وقت اٹھتا تھا۔ باقی سب کچھ وہی ہوتا' جو پہلے دن ہوا تھا۔

نماز اور وظائف سے فارغ ہونے کے بعد مرزا لاؤنج میں آ بیٹھے۔ چوزی سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ نجمہ بیگم ابھی تک سو رہی تھیں۔ مرزا نے چوزی کے سامنے باجرہ ڈالا۔ چوزی نے بے دلی سے باجرہ کھایا اور پھر ان سے جڑ کر بیٹھ گیا۔

مرزا اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔

دس بج گئے۔ مرزا کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ یہ نئی کمپنی انہیں سوٹ کر گئی تھی۔ نجمہ بیگم بیدار ہوئیں تو مرزا اور چوزی ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ مرزا کو تو بیگم کے اٹھنے کا پتہ ہی نہیں چلا وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہیں۔ چوزی کبھی اٹھتا اور مرزا کے ایش ٹرے میں کود کر سگریٹ کے ٹوٹوں اور راکھ میں چونچیں چلانے لگتا۔ مرزا اسے پکڑ کر ہٹاتے تو وہ پھر ان کے گھٹنے سے ٹک کر بیٹھ جاتا۔ مرزا کا لیکچر جاری رہتا۔ ذرا دیر بعد چوزی پھر ایش ٹرے پر ٹوٹ پڑتا۔

پھر ایک بار مرزا بھنا گئے۔ "یہ تو بہت بری بات ہے چھوٹو۔" انہوں نے پہلی بار غصے میں اسے چھوٹو کہا۔ بعد میں یہ روایت بن گئی کہ پیار میں وہ اسے چوزی اور غصے میں چھوٹو کہتے تھے۔ "یہ جو کچھ تم کر رہے ہو' یہ بہت سارے پہلوؤں سے' بہت سارے لوگوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارے لئے مضر صحت ہے۔ تم پڑھے لکھے ہوتے تو سگریٹ کے پیکٹ پر چھپا وزارت صحت کا خبردار کرنے والا نوٹ اور اس کے نیچے ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس کی رقم دیکھ لیتے' جو سرکار کے خزانے میں جاتی ہے۔ اب سگریٹ نقصان دہ ہے' دھواں نقصان دہ ہے تو راکھ اور ٹوٹے ان سے بڑھ کر نقصان دہ ہوں گے۔ لہٰذا تم اپنی جان پر ظلم کر رہے ہو۔

دوسرے تمہارے اس عمل سے مجھے ذہنی تکلیف ہو رہی ہے۔ تیسرے تم جو

چونچیں مارتے ہو تو راکھ اڑ کر گھر میں پھیلتی ہے بلکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کئی ٹوٹے بھی ادھر ادھر اڑا چکے ہو۔ اس سے تمہاری دادی کو بھی پریشانی ہو گی اور صفائی کرنے والی ماسی بھی تمہیں برا بھلا کہے گی۔ پھر یہ گناہ بے لذت بھی ہے---"

مرزا کا پہلو دار لیکچر جاری رہتا لیکن نجمہ بیگم نے مداخلت کر ڈالی۔ "اس بے چارے کی سمجھ میں کہاں آئے گا یہ۔"

مرزا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "اٹھ گئیں آپ--- اور سنئے' یہ چھوٹو سب سمجھتا ہے۔" پھر وہ چوزی کی طرف مڑے۔ "اب اگر تم نے ایش ٹرے کو چونچ بھی لگائی تو اس زور کا جھانپڑ ماروں گا کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تمہاری۔"

اور چوزی سہم کر ان کے گھٹنے سے جڑ کر بیٹھ گیا۔

مرزا نے اسے غور سے دیکھا۔ "خفا ہو گئے؟"

چوزی منہ پھلائے بیٹھا رہا۔

مرزا نے اس کا سر انگلی سے سہلایا۔ "اب ہم پیار کرتے ہیں تو بری بات پر ڈانٹیں گے بھی۔ بڑوں کی بات کا برا نہیں مانتے۔" وہ بولے۔ "اچھا سنو--- اب دادی اٹھ گئی ہیں ناشتہ بنائیں گی۔ تم دیکھنا' میں تمہیں کیسا تر پراٹھا کھلاتا ہوں۔"

نجمہ بیگم کو خیال آیا کہ مرزا گزشتہ رات سے انہیں چوزی کی دادی قرار دے رہے ہیں۔ اس پر انہیں سخت اعتراض تھا لیکن وہ یہ--- سوچ کر چپ ہو گئیں کہ مرزا بچوں کو بری طرح مس کر رہے ہیں۔ چلنے دو۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ ٹائٹل مستقل طور پر ان کا ہونے والا ہے۔ یوں کہ وہ خود بھی خود کو چوزی کی دادی تسلیم کر لیں گی۔ "اب آپ ناشتے میں پراٹھا تو نہیں لیں گے---" وہ بولیں۔

"کیوں--- ایسا کیا ہو گیا؟" مرزا بولے۔

"ساڑھے دس بجے ہیں۔"

"ایں---" مرزا نے چونک کر کلاک کی طرف دیکھا۔ یہ سچ تھا کہ دیر ہو جانے کی صورت میں وہ پراٹھا نہیں کھاتے تھے۔ "خیر--- اسے چھوڑو میں تو پراٹھا ہی کھاؤں گا۔ ذرا تر کر کے پکانا پراٹھا۔"

نجمہ بیگم جانتی تھیں کہ وہ چوزی کی وجہ سے پراٹھے پر اڑے ہیں مگر انہوں نے

یہ بات کہی نہیں۔ انہیں دیر سے اٹھنے پر شرمندگی تھی وہ خاموشی سے کچن میں چلی گئیں۔

مرزا اب کچھ سوچ رہے تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ کلاک کی طرف دیکھ کر انہیں شاک لگا تھا۔ وہ پونے پانچ بجے اٹھے تھے گویا انہیں جاگے ہوئے تقریباً چھ گھنٹے گزر گئے تھے۔ چھ گھنٹے! اور وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا اور جب وقت گزرنے کا پتہ نہ چلے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ وقت بہت اچھا گزرا ہے۔

اور وقت ان کا اچھا گزرا تھا مگر یہ ناقابل یقین بات تھی۔ گھر میں اماں نہیں تھیں' بیٹے نہیں تھے' بہوئیں نہیں تھیں' پوتی اور پوتے بھی نہیں تھے اور نجمہ بیگم بھی سو رہی تھیں۔ آوازوں سے بھرا رہنے والا گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا اور پھر بھی انہوں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا! کیسے؟

اس پر سوچتے ہوئے مرزا کی سمجھ میں ایک بہت بڑی بات آگئی۔ زندگی کا ایک بڑا راز انہوں نے سمجھ لیا۔ انہوں نے جان لیا کہ جب آپ کسی دکھ' کسی پریشانی یا کسی مشکل سے دوچار ہوں اور ایسے میں آپ کسی اور کی دل جوئی کریں جو اسی طرح کے کسی دکھ' پریشانی یا مشکل میں گرفتار ہو اور جس کا دکھ آپ سے بڑا ہو تو آپ کا دکھ خودبخود دور ہو جاتا ہے۔

مرزا اس پر غور کرتے رہے۔ ابھی صرف چوبیس گھنٹے پہلے انہوں نے چوزی کی آواز میں تنہائی کا نوحہ سنا تھا۔ وہ تڑپ گئے تھے۔ انہیں اس پر بہت ترس آیا تھا۔ اتنی ننھی سی جان اور اتنی مہیب تنہائی۔ تب سے انہوں نے چوزی کی تنہائی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ انہوں نے اس کے آرام کی فکر کی تھی اور اس کے نتیجے میں خود انہیں بھی آرام ملا تھا۔ طمانیت اور خوشی ملی تھی۔

انہیں یاد تھا پرسوں رات وہ بہت دیر تک سو نہیں سکے تھے اور جب سوئے تھے تو اچھی اور گہری نیند نہیں آئی تھی۔ تنہائی کا احساس اور گھر کی ویرانی ان کے دل کو ڈس رہی تھی۔ وہ بہت ناخوش تھے مگر پچھلے روز چوزی کو وقت دینے کے بعد سے وہ بات نہیں رہی تھی۔ انہوں نے چوزی کے دانے پانی کی فکر کی تھی تو انہیں خود اچھی طرح بھوک لگی تھی اور انہوں نے اچھی طرح کھانا کھایا تھا اور نیند سے بے حال

چوزی کو سلا کر وہ لیٹے تھے تو ان کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا مگر انہیں فوراً ہی نیند آگئی تھی اور وہ بہت گہری اور پرسکون نیند سوئے تھے۔ پرسوں ان سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور آج چوزی کی معیت میں وہ چھ گھنٹے بیٹھے رہے تھے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اتنا وقت گزر گیا ہے۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی مخلوق' ایک ننھے سے چوزے کو کمپنی دی تھی۔

واہ--- کیا نسخہ کیمیا ہاتھ آیا ہے۔ انہوں نے سوچا۔ خیر دو طرفہ ہوتی ہے۔ آپ کسی کا بھلا کریں تو آپ کا بھی بھلا ہو گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آپ کو نیند ستا رہی ہو تو کسی نیند کے ترسے ہوئے کو سلانے کا اہتمام کریں۔ آپ کو تنہائی ستائے تو اپنے سے زیادہ تنہا آدمی کی تنہائی دور کریں۔ کوئی دکھ ہو تو اپنے سے زیادہ دکھی کسی شخص کے دکھ کا مداوا کریں۔ آپ کے پاس آدھا پیٹ کھانا ہو تو دو وقت کے بھوکے کے ساتھ مل کر کھائیں--- واہ--- خوشی کا حصول کتنا آسان ہے۔ آپ کو خودبخود نیند آجائے گی۔ آپ کی تنہائی خودبخود دور ہو جائے گی۔ آپ کے دکھ کا خودبخود مداوا ہو جائے گا۔ پیٹ بھرنے سے جو خوشی ملتی ہے' آپ کو خالی پیٹ اس سے زیادہ خوشی ملے گی۔ بس دوسروں کی طرف دیکھیں' جو آپ سے زیادہ محروم' آپ سے زیادہ پریشان اور دکھی ہوں--- اور ان کیلئے کچھ کرنے کی کوشش کریں۔

انہوں نے بڑی محبت سے چوزی کو پکڑ کر اٹھایا اور اپنے چہرے کے قریب لے آئے۔ "واہ چوزی تو تو بڑا عالم ہے۔ ایک دن میں مجھے اتنا کچھ سکھا دیا۔" وہ بولے۔ "اور پگلے' تو تو جانتا ہی نہیں کہ محبت کیا ہے مگر پھر بھی سن لے مجھے تجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ آئی لو یو چوزی۔"

نجمہ بیگم نے آکر دسترخوان بچھا دیا۔ مرزا ہاتھ دھو کر آئے۔ نجمہ بیگم نے ناشتہ رکھا۔ فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکال کر رکھی۔ مرزا نے پراٹھے کا چھوٹا سا ٹکڑا لے کر اسے ہتھیلیوں سے ملا۔ ملیدہ بن گیا۔ وہ انہوں نے ہتھیلی پر رکھا اور چوزی کو بھی ہتھیلی پر بٹھا لیا۔ چوزی کھانے لگا اور وہ محبت سے اسے دیکھنے لگے۔

پھر چوزی کا دل بھر گیا۔ انداز میں بے رغبتی آگئی۔ مرزا نے اسے اتارا اور دوبارہ ہاتھ دھو کر آئے اور ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ "آپ بھی آئیں نا۔" انہوں نے

بیگم سے کہا۔

"ذرا اسے بند کر دوں۔" نجمہ بیگم نے چوزی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں اسے کبھی بند نہیں کیجئے گا۔" مرزا نے جلدی سے کہا۔ "جب یہ بستر پر سوتا ہے تو پنجرے سے اس کا کیا واسطہ۔"

"تو یہ ہمیشہ کھلا پھرا کرے گا؟"

"جی ہاں— اس میں حرج کیا ہے؟"

نجمہ بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گئیں۔

پھر ان دونوں نے ایک بہت خوب صورت منظر دیکھا۔ فریج سے نکالی گئی پانی کی بوتل کو پسینہ آ گیا تھا۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے بوتل کی بیرونی سطح پر ابھر آئے تھے اور چوزی کا عجیب حال تھا۔ وہ بے تابی سے بوتل کا طواف کرتا۔ رکتا اور بوتل پر اپنی چونچ رکھتا۔ پھر چونچ اوپر کر کے پانی حلق سے اتارتا پھر طواف شروع کرتا اور پھر وہی کچھ ہوتا۔

"واہ— اس کی تو ویڈیو بنانی چاہئے تھی۔" نجمہ بیگم نے بے ساختہ کہا پھر وہ اٹھیں۔ "تصویر تو بنا ہی لوں۔ کیمرے میں ریل بھی ہے۔"

نجمہ بیگم نے اس کیفیت میں چوزی کی کئی تصویریں بنائیں۔ مرزا تاسف سے سر ہلاتے رہے۔ "ہم کتنے بے خبر ہیں۔" وہ بولے تو ان کے لہجے میں افسوس تھا۔ "یہ کتنا پیاسا ہے۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اسے پیاس لگتی ہو گی۔ دیکھو تو' کیسا بے تاب ہو رہا ہے۔"

"آپ ہیں بے خبر' میں نہیں ہوں۔ میں نے اسے کل بھی پانی پلایا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ چوزوں کو دن میں ایک بار پانی پلانا چاہئے۔ زیادہ پانی نقصان دہ ہو جاتا ہے۔"

اس روز یہ بات طے ہو گئی کہ چوزی مرزا کا ہے۔ وہ گھر میں ہوتے تو وہ ان کے ساتھ چپکا رہتا۔ وہ چلتے تو وہ ان کے پیچھے یوں چلتا جیسے ان کی ایڑیوں میں اس کیلئے کوئی مقناطیسی کشش موجود ہے۔ وہ بیٹھتے یا لیٹتے تو وہ ان کے پاس بیٹھا رہتا۔ کبھی ان کی گود میں چڑھ جاتا۔ وہ گھر میں نہ ہوتے تو چوزی نجمہ بیگم کے پیچھے لگا رہتا۔

دو دن بعد اماں واپس آ گئیں۔ وہ یہ نقشہ دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ مرزا اور چوزے سے اتنی دلچسپی! اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر چوزے کی ان پر فریفتگی نے بھی اماں کو حیران کیا۔ "ارے منے' یہ تو تیرے پیچھے اس طرح لگا رہتا ہے جیسے تو مرغی ہو۔"

مرزا جھینپ گئے۔ "ابھی بچے آ جائیں گے اماں' تو یہ سب کا ہو جائے گا۔"

12 تاریخ کو سب لوگ آ گئے۔ بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ سارا دن گھر میں ہنگامہ ہوتا۔ بچوں کو چوزی سے پھر دلچسپی ہو گئی مگر چوزی صرف اور صرف مرزا صاحب کا رہا۔ وہ ہر وقت انہی کے ساتھ لگا رہتا۔ بچوں کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ وہ اسے لبھا نہ سکے۔

"منے— یہ سچ مچ تجھے اپنی ماں سمجھتا ہے۔" ایک دن اماں نے ہنس کر کہا۔

مرزا مسکرا دیئے۔ انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا اور اس پر خوش بھی تھے۔ "یہی بات ہے اماں مگر وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔"

"ارے منے— انسان اور جنات کے علاوہ اللہ کی ہر مخلوق شکر گزار ہے۔ وہ قرآن شریف میں اللہ نے فرمایا ہے نا کہ آسمانوں میں' زمینوں میں اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے' اللہ کی تسبیح اور اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہے۔"

"مگر وہ رب کیلئے ہے نا اماں!"

"ایک بات یاد رکھ منے جو وسیلے کا شکر گزار نہیں ہوتا' وہ اپنے رب کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ وسیلے کا احترام بھی ضروری ہے۔ چوزی صرف اسی بات پر ہمیشہ کیلئے تیرا ہو گیا منے کہ جب وہ تنہائی سے گھبرا کر چیخ رہا تھا تو تو نے اسے کھولا تھا۔"

چوزی اور چوزی کے واسطے سے مرزا نے بہت کچھ سیکھا۔ بچوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ چوزی صرف دادا کا ہے۔ اس کے باوجود وہ چاروں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتے تھے۔ انہیں کبھی اس سے رقابت محسوس نہیں ہوئی۔ مرزا کو احساس تھا کہ چوزی کی وجہ سے بچوں پر ان کی توجہ کم ہو گئی ہے لیکن بچوں نے کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ تو دادا کے شکر گزار تھے کہ انہوں نے ان کے چوزی کا اتنا خیال رکھا کہ وہ ان کا ہو گیا۔ جبکہ انہوں نے

اسے نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ چاروں دادا کا احسان مانتے تھے۔

مرزا نے چوزی سے آوازوں کو سمجھنا سیکھا۔ پہلی جو آواز انہوں نے سمجھی' وہ خوف کی تھی' جو چوزی خطرہ محسوس کر کے نکالتا تھا۔ اس کا تجربہ انہیں پہلے ہی دن ہو گیا تھا۔ وہ جب بھی چوزی کی طرف ہاتھ بڑھاتے وہ ٹٹٹ ٹٹٹ کی مسلسل آواز نکالتے ہوئے پیچھے ہٹتا۔ ویسے وہ خود چاہتا تو ان کی گود میں چڑھ کر بیٹھ جاتا لیکن ان کا ہاتھ اسے پکڑنے کیلئے بڑھتا تو وہ ڈر کر آواز نکالتا۔ حالانکہ وہ ان سے ڈرتا نہیں تھا' بس یہ جبلت تھی اس کی۔

مرزا کو اس آواز کے بارے میں پتہ نہ چلتا مگر اگلے ہی روز انہوں نے ٹی وی لاؤنج سے چوزی کی یہ پکار سنی۔ وہ اس طرف آئے تو انہوں نے دیکھا کہ کھلے ہوئے دروازے اور لوہے کے بند گیٹ کے باہر وہ سیاہ بلی کھڑی ہے پھر انہوں نے چوزی کو دیکھا وہ اپنی جگہ جیسے بت بن گیا تھا۔ اس کی پشت پر تمام بال کھڑے تھے اور وہ اس ڈری ڈری آواز میں پکار رہا تھا۔ اس وقت اس میں ہلنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔

مرزا نے غور سے بلی کو دیکھا وہ مکمل طور سے سیاہ تھی۔ اسے دیکھ کر خود انہیں بھی خوف کا احساس ہوا۔ انہوں نے دور سے بلی کو ہشکارا مگر وہ ڈھیٹ بھی بہت تھی۔ وہاں سے ہلی بھی نہیں۔ انہیں دروازے پر جا کر اسے بھگانا پڑا۔ پھر انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ چوزی کے پاس آئے تو وہ نارمل ہو چکا تھا۔

پھر ایک روز انہوں نے چوزی کی ایک اور آواز سنی۔ وہ اس پر غور کرتے رہے۔ انہیں خیال آیا کہ صبح سے اس نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے سامنے باجرہ ڈالا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑا اور اس دوران میں جو آواز نکال رہا تھا' اسے پہچاننے میں مرزا کو کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

چوزی کی اس آواز کے حوالے سے مرزا باہر کے آزاد پرندوں کی آوازیں بھی سمجھنے لگے۔ انہوں نے اپنے کمرے کی گیلری میں پرندوں کیلئے ایک ٹرے لگا رکھی تھی جس میں باجرہ اور چاول ڈالتے رہتے تھے۔ گرل کی جالی میں پانی کیلئے ایک برتن بھی پھنسا رکھا تھا۔ اس روز جو چڑیاں بولیں تو مرزا نے سمجھ لیا کہ وہ بھوکی ہیں۔ وہ گیلری میں گئے' چڑیاں انہیں دیکھتے ہی اڑ گئیں۔ مرزا نے دیکھا کہ ٹرے بھی خالی تھی اور پانی

کا برتن بھی۔ انہوں نے پانی بھی بھرا اور چاول اور باجرہ بھی ٹرے میں ڈال دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت ساری چڑیاں ٹرے میں آ بیٹھیں۔ انہیں ان کی موجودگی کی بھی پروا نہیں تھی۔ وہ چگ رہی تھیں اور چوزی کی طرح اسی مخصوص آواز میں بول رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ چڑیاں ان کا شکریہ ادا کر رہی ہیں۔

ایک تشویش ناک بات ہوئی تھی۔ کالی بلی اب باقاعدگی سے اوپر آنے لگی تھی۔ اس پر بچے مشتعل ہو گئے تھے۔ وہ اسے مارنے پر تل گئے تھے مگر اماں اور نجمہ بیگم ہمیشہ انہیں سمجھاتی رہتی تھیں۔ دونوں کا انداز البتہ الگ الگ تھا۔ "بیٹے۔۔۔ بلی کو مارنا گناہ ہوتا ہے۔ بلی کو کبھی نہیں مارنا چاہیے۔" نجمہ بیگم کہتیں۔

"چاہے وہ ہمارے چوزے کی دشمن ہو؟" اشفاق نے چڑ کر کہا۔

"ہاں تمہیں اپنے چوزے کی حفاظت کا خیال کرنا چاہیے۔"

"اور کالی بلی کو تو کبھی بھولے سے بھی نہ مارنا۔" اماں کہتیں۔

"کیوں بڑی اماں؟"

"بس کہہ جو دیا' کبھی نہ مارنا۔"

"کالی بلی کے بھیس میں جن بھی ہوتے ہیں۔" اماں نے کہہ ہی دیا۔

"سچ مچ بڑی اماں!" بچے سہم گئے۔

اب چوزی سوا دو ماہ کا ہو چکا تھا۔ وہ کچھ بڑا بھی ہو گیا تھا مگر اس بات پر سب متفق تھے کہ وہ غیر معمولی چوزہ ہے۔ اس کی سمجھ بوجھ انسانوں کی سی ہے اور وہ ساری باتیں سمجھتا ہے۔

ایک بات تھی چوزی' مرزا کا کہنا بہت مانتا تھا۔ لگتا تھا ان کی زبان سمجھتا ہے۔ اسے ان کی ایش ٹرے میں گھسنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس پر اسے ڈانٹتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں زیادہ ہی غصہ آ گیا۔ "چھوٹو۔۔۔ اب تم ایش ٹرے میں گھسے تو تمہیں بہت ماروں گا میں۔" انہوں نے گرج کر کہا۔

چوزی سہم کر ان کی گود میں چھپ گیا۔ اس دن کے بعد وہ کبھی ایش ٹرے میں نہیں گھسا۔

دسترخوان بچھتا تو چوزی اس پر ٹوٹ پڑنے کیلئے بے تاب ہو جاتا مگر مرزا ڈانٹتے

"خبردار چوزی جو بدتمیزی کی۔" اور چوزی فوراً مودب ہو کر بیٹھ جاتا۔

ابتدا میں نماز پڑھنے کے دوران میں چوزی سامنے آ جاتا۔۔ جاء نماز پر بیٹھ جاتا۔ مرزا سجدے سے بڑی احتیاط سے اٹھتے' قعدے میں بہت سنبھل کر بیٹھتے کہ کہیں چوزی نیچے نہ آ جائے۔ پھر ایک دن انہوں نے یونہی کہا۔ "چوزی نماز پڑھتے ہوئے سامنے نہیں آتے۔"

اس کے بعد چوزی ہمیشہ مصلے کے کنارے پر بیٹھتا۔ ہاں جیسے ہی وہ دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتے وہ ان کی گود میں آ بیٹھتا۔

قرآن پاک کے بارے میں کبھی چوزی کو ٹوکنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ حالانکہ مرزا کو ڈر رہتا کہ کہیں وہ اس پر چڑھ نہ جائے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ قرآن مجید پڑھتے تو چوزی ذرا فاصلے پر سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ تلاوت کے دوران میں کبھی اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلتی۔

اب تو بچوں نے چوزی کیلئے ایک گانا بنا لیا تھا۔ وہ قطار میں کھڑے ہوتے اور تالیاں بجاتے ہوئے ایک آواز میں گاتے۔ چوزی۔۔ دادا کی جان ہے چوزی۔۔ ہم سب کا مان ہے چوزی اور اس دوران میں چوزی سینہ پھلائے یوں اتراتا ہوا ان کے سامنے سے گزرتا جیسے گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہا ہو۔ بچے بھی بدمعاش تھے اگلا مصرع انہوں نے بنایا تھا لیکن بے ایمان ہے چوزی۔

مرزا چوزی کے حوالے سے غور کرتے' مشاہدہ کرتے اور اللہ کی قدرت پر اش اش کرتے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔۔ ہم نے بے جان سے جاندار کو پیدا فرمایا اور جاندار سے بے جان کو۔ اور اتنی سی' اتنی خوب صورت چیز۔ اتنی نازک کہ ٹھیس لگے تو مر جائے اور پھرتی ایسی کہ نوزائیدہ چوزے کے سامنے انسان ہار جائے۔ اتنی سی جان میں کتنی توانائی ہے۔ واہ۔۔ کیا صناعی ہے۔ اللہ نے چیلنج کیا تو ہے۔۔ اگر تمہیں تخلیق کا دعویٰ ہے تو ایک مکھی پیدا کر کے دکھا دو۔

اور کوئی انکار کرنے والا آج تک اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکا۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے مرزا کی آنکھ لگ گئی۔

○

بچوں کیلئے اسکول کے یونیفارم اور جوتوں کی خریداری کرنی تھیں۔ ثمینہ اور روبینہ' نجمہ بیگم کے پیچھے پڑ گئیں کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں۔ نجمہ بیگم ٹال رہی تھیں۔

"چلیں نا دادی!" بچے بھی ضد کرنے لگے۔

"بیٹے۔۔ اماں اکیلی رہ جائیں گی۔" نجمہ بیگم نے عذر پیش کیا۔

"ابو تو ہیں گھر میں۔" روبینہ بولی۔ "اور ہمیں زیادہ دیر تو نہیں لگے گی۔ سات بجے تک آ جائیں گے۔"

"تمہارے ابو کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ بڑی اماں کے پاس میں رہ لوں گا۔" اشفاق بولا۔

"میں بڑی اماں کا خیال رکھوں گا۔"

نہیں بیٹے۔"

مگر اماں نے نجمہ بیگم کی بات کاٹ دی۔ "چلی جاؤ بہو۔ تھوڑی دیر کی تو بات ہے میری دوسراہٹ کیلئے اشفاق کافی ہے۔"

یوں نجمہ کو بھی تیار ہونا پڑا۔

سب کے جانے کے بعد اشفاق اماں کے کمرے میں چوزی کے ساتھ کھیلتا رہا۔

اچانک اماں کی نظر گھڑی پر پڑی۔ پونے چھ بجے تھے۔ "ارے۔۔ آفتاب نے کہا تھا کہ چھ بجے ابو کو ڈاکٹر کے ہاں بھیج دیجئے گا اور منا سو رہا ہے شاید۔"

انہوں نے مرزا کو آوازیں دیں۔ اٹھنے کی ان کی ہمت نہیں ہوئی مگر مرزا آوازوں سے اٹھنے والے کب تھے۔ "اشفاق بیٹے' چوزی کو لے جا کر اپنے دادا کے پاس چھوڑ دو۔" انہوں نے بچے سے کہا۔ "یہ اسے جگا دے گا۔"

اشفاق چوزی کو دادا کے کمرے میں لے گیا۔ چوزی نے فوراً ہی سمجھ لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

○

کان میں مخصوص گدگدی ہوئی تو مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ "کیا بات ہے چوزی۔ نیند کے دشمن۔" انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

چوزی نے پھر کان میں چونچ چبھو دی۔

مرزا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "سونے ہی نہیں دیتا کبھی۔"

دوسرے کمرے سے اماں کی آواز آئی۔ "اس پر غصہ مت کر منے۔ میں نے کہا تھا اٹھانے کو۔ تجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے' چھ بج رہے ہیں۔"

"کل چلا جاؤں گا اماں۔ اس وقت بہت نیند آ رہی ہے۔" مرزا نے بلند آواز میں کہا۔

"کل کیسے چلا جائے گا۔ ڈاکٹر نے وقت آج کا دیا ہے۔ اٹھ جا فوراً ورنہ مجھے آنا پڑے گا۔"

"اٹھ گیا اماں۔ باتھ روم جا رہا ہوں۔" مرزا نے مری مری آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد مرزا تیار ہو کر اماں کے کمرے میں آئے۔ "باقی سب لوگ کہاں گئے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"بچوں کو کپڑے دلانے کیلئے گئے ہیں۔"

مرزا کو تو بہانہ مل گیا۔ وہ مچل گئے۔ "آپ کو اکیلا چھوڑ کر تو میں نہیں جاؤں گا۔"

"میں اکیلی کب ہوں' اشفاق ہے نا میرے پاس۔"

"کچھ بھی ہو۔"

"منے' بہانے بازی نہ کر۔ یہ میرا حکم ہے۔ تجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" اماں نے غصے سے ان کی بات کاٹ دی۔

اب مرزا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ "ٹھیک ہے اماں میں جا رہا ہوں۔" انہوں

نے کہا۔

دروازے سے نکلنے کے بعد انہوں نے پلٹ کر کارنر پر رکھی ہوئی ٹائم پیس میں وقت دیکھا سوا چھ بجے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کی گھڑی میں دیکھا اس میں بھی سوا چھ بجے تھے۔ اشفاق اور چوزی دروازے پر کھڑے تھے۔ "بیٹے۔۔ اماں کا اور چوزی کا خیال رکھنا۔" انہوں نے اشفاق سے کہا۔ "اچھا چوزی' اللہ حافظ۔"

نیچے اتر کر انہیں خیال آیا کہ انہوں نے اشفاق سے دروازہ بند کرنے کو نہیں کہا ہے پھر انہوں نے سوچا دروازہ بند کیا بھی نہیں جا سکتا لاک تک اشفاق کا ہاتھ جاتا نہیں ہے اور سخت ہونے کی وجہ سے اماں لاک کھول نہیں پاتیں۔ پھر بھی وہ اشفاق سے لوہے کا گیٹ بند کرنے کی تو کہہ ہی سکتے تھے۔ ان کا جی چاہا کہ واپس جائیں مگر تین منزل سیڑھیاں چڑھنے کا تصور انہیں اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے سوچا' اشفاق سمجھ دار ہے' خود ہی اس بات کا خیال رکھ لے گا۔

باہر عام طور پر ٹیکسیاں کھڑی رہتی تھیں لیکن اس وقت کوئی ٹیکسی موجود نہیں تھی۔ وہ سڑک پر جا کھڑے ہوئے۔ خاصی دیر ہو گئی۔ جو ٹیکسی بھی گزری' وہ بھری ہوئی تھی۔ ایک خالی ٹیکسی نظر بھی آئی لیکن اس کے ساتھ بات نہیں بنی۔

مرزا نے گھڑی میں وقت دیکھا چھ بج کر پینتیس منٹ ہو چکے تھے۔ انہوں نے ٹیکسی کا خیال دل سے نکالا۔ ویگن آئی تو وہ اس میں بیٹھ گئے۔ ویگن سے اتر کر انہیں کلینک تک پہنچنے کیلئے سڑک پار کرنا تھی۔ اسی سے گھبرا کر وہ ٹیکسی پر زور دے رہے تھے۔ اس سڑک پر ٹریفک بہت ہیوی تھا۔ وہاں سے چوبیس گھنٹے ٹرالر تک گزرتے رہتے تھے۔ دوسرا ٹریفک بھی کم نہیں تھا۔ وہ سڑک پار کرنے سے ویسے ہی گھبراتے تھے مگر اس سڑک سے تو ان کا دم ہی نکلتا تھا۔

وہ چند لمحے کھڑے موقع ملنے کا انتظار کرتے رہے پھر ان کی دانست میں موقع مل ہی گیا۔ آتی ہوئی ویگن چند مسافروں کو بٹھانے کیلئے رکی تو انہوں نے سڑک پار کرنے کیلئے دوڑ لگا دی مگر ویگن کی حد سے نکلتے ہی چوڑی سڑک پر انہیں دو گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک کار تھی جو بہت تیز رفتاری سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے دائیں جانب ایک سیاہ ٹرالر تھا جو کار کی نسبت کم رفتار تھا مگر پھر بھی اس کی رفتار کم

نہیں تھی۔ مرزا نے ویگن کی طرف دیکھا وہ پسنجر کو بٹھانے کے بعد چل پڑی تھی۔ یعنی واپسی کا راستہ نہیں تھا۔

مرزا گھبرا تو گئے لیکن انہوں نے اللہ کا نام لے کر دوڑ لگا دی۔ بیچ سڑک میں اس طرح پھنس جانے کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ تیزی سے آگے کی طرف لپکے۔ تیز رفتار کار زن سے تقریباً ان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کی وجہ سے وہ ایک ثانئے کیلئے غیر متوازن سے ہو گئے۔ کن انکھیوں سے انہوں نے دیکھا دیو قامت سیاہ ٹرالر کافی قریب آ چکا تھا۔ ان کے پاس مہلت بالکل نہیں تھی۔

وہ لپکے۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ ٹرالر سے بھی بچ نکلیں گے مگر آخری لمحے میں انہوں نے ٹرالر کو بہت قریب محسوس کیا۔ انہوں نے رفتار اور بڑھائی پھر انہیں احساس ہوا کہ کوئی بہت ٹھوس اور طاقتور دیوار ان سے ٹکرائی ہے۔ وہ فضا میں اچھلے نیچے آتے ہوئے انہیں لگا کہ ہوش و حواس ان کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔

○

اشفاق نے لوہے کا گیٹ بند کر لیا تھا۔

وہ بڑی اماں کے کمرے میں چوزی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجی تو وہ دروازے کی طرف گیا۔ چوزی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

دروازے پر اوپر کے فلیٹ والی آنٹی کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈھکی ہوئی ایک پلیٹ تھی۔ "گھر میں کوئی نہیں ہے بیٹے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی--- صرف بڑی اماں ہیں۔"

"اچھا یہ رکھ دو۔ دادی کو بتا دینا۔"

اشفاق نے پلیٹ لی اور کچن کی طرف چلا۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے اوپر کی پلیٹ اٹھا کر دیکھا۔ پلیٹ میں زردہ تھا۔ اس کا جی چاہا کہ تھوڑا سا چوزی کو کھلا دے پھر اسے خیال آیا کہ دادی ہمیشہ کہتی ہیں کہ چوزی کو جو کچھ بھی ڈالو کنارے ڈالا کرو تاکہ پیروں میں نہ آئے۔ وہ پلیٹ لے کر لکڑی کے کارنر کی طرف گیا۔ چوزی نے بھی امکان کو محسوس کر کے آوازیں نکالنی شروع کر دی تھیں۔ اشفاق نے تھوڑا سا زردہ کارنر کے قریب ڈال دیا۔ پھر وہ پلیٹ لے کر کچن میں چلا گیا۔

کچن میں کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر پلیٹ رکھنے کے بعد اس کے دل میں آئی کہ زردہ چکھ کر تو دیکھا جائے۔ اس نے ایک نوالہ منہ کی طرف بڑھایا۔ اسی لمحے اسے لاؤنج سے چوزی کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے نوالہ منہ میں ڈالا اور باہر لپکا۔ مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔

چوزی نے زردے کے چاول چگتے چگتے کسی نامعلوم حس کے زیر اثر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ کالی بلی لوہے کے کھلے گیٹ سے اندر آ چکی تھی اور حملہ

کرنے کے انداز میں اس کی طرف دبے پاؤں بڑھ رہی تھی۔ وہ چگنا بھول گیا۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر اس سے ہلا بھی نہیں گیا۔ اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگی۔

کالی بلی کو معلوم تھا کہ شکار بھاگ نہیں سکتا۔ وہ خوف سے سن ہو چکا ہے۔ وہ سکون سے دبے پاؤں بڑھتی رہی مگر پھر اسے کچن کی طرف سے لپکتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اپنا پیٹ فرش پر لگایا اور حملے کیلئے تیار ہو گئی۔

عین اسی لمحے اماں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ حلق کے بل چلائیں۔ "ارے اشفاق' وہ موذی بلی۔ جلدی کر بیٹے۔"

اماں کی چیخ نے بلی کو مہمیز کر دیا۔ اس نے جست لگائی۔

اشفاق نے کچن سے نکلتے ہوئے بلی کو جست کی حالت میں دیکھا۔ وہ بوکھلا کر بلی کو مارنے کیلئے کوئی چیز دیکھنے لگا۔ اسی لمحے بلی نے چوزے کو دبوچا مگر رفتار پر قابو نہ رکھنے کی وجہ سے لکڑی کے کارنر سے ٹکرائی۔ نہ جانے کیسے لکڑی کا پورا کارنر دھڑام سے نیچے آ گرا۔ بلی کے چوٹ لگی تو وہ بوکھلا گئی۔ چوزہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ اس نے دوبارہ اسے منہ میں دبوچا اور باہر کی طرف لپکی۔

اشفاق کا خون کھول رہا تھا۔ اسے مارنے کی کوئی چیز نہیں ملی۔ بلی کو باہر بھاگتے دیکھ کر وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے پوری قوت سے بلی کے پیٹ میں لات ماری۔ بلی دروازے سے ٹکرائی۔ وہ سنبھل کر اٹھی اور باہر بھاگی۔ اس نے تین سیڑھیاں پھلانگی تھیں کہ اشفاق پھر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس بار جو اس کے لات لگی تو وہ دور جا کر گری۔ چوزہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ وہ گھبرا گئی تھی اس لئے چوزہ اٹھانے کے بجائے فرار ہو گئی۔

اشفاق چوزی کے پاس جا بیٹھا اور اسے پکارنے لگا۔ "چوزی۔۔۔ چوزی۔۔۔ اٹھو چوزی۔"

اماں بھی باہر آ گئیں۔ انہوں نے چوزی کو ایک نظر دیکھا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ "بیٹے۔۔۔ چوزی تو اللہ میاں کے پاس چلا گیا ہے۔" وہ بولیں۔

اشفاق تو یہ سنتے ہی پاگل ہو گیا۔ "میں اس موذی کو نہیں چھوڑوں گا بڑی

اماں۔"

اماں کو اندازہ تھا کہ وہ بھاگ کر نیچے جانے کی کوشش کرے گا۔ انہوں نے اس سے پہلے ہی اسے دبوچ لیا مگر اشفاق پر جنون طاری تھا۔ وہ رو رہا تھا اور مٹھیاں بھینچ کر چلا رہا تھا۔ "مجھے چھوڑ دیں بڑی اماں۔ میں اس موذی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

اماں نے سمجھ لیا کہ اس کیفیت میں وہ اسے زیادہ دیر نہیں روک سکیں گی اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ کالی بلی پر حملہ کرے۔ وہ زور سے چلائیں۔ "ارے کوئی ہے۔ جلدی سے آؤ' اسے روکو۔"

اوپر والی اشفاق کی آواز سن کر پہلے ہی نیچے آنے کیلئے نکلی تھیں۔ اماں کی پکار سن کر وہ بھاگیں۔ انہوں نے اشفاق کو جکڑ لیا۔ "کیا ہوا بیٹے۔"

"اس موذی نے میرے دادا کے چوزی کو مارا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔" اشفاق کف اڑا رہا تھا۔

نیچے والے فلیٹ کی عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ سب نے مل کر اشفاق کو نیچے جانے سے روکے رکھا۔

○

وہ لوگ زینے کے قریب پہنچے تھے کہ انہوں نے کالی بلی کو بھاگ کر جاتے دیکھا۔ پھر انہیں چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے اشفاق کی آواز کو پہچان لیا۔ بچے تیزی سے زینے پر لپکے۔ بڑے ان کے پیچھے تھے۔ "اللہ خیر کرے۔" نجمہ بیگم بڑبڑائیں۔

تینوں بچوں نے اوپر پہنچ کر چوزی کو دیکھا تو سناٹے میں آ گئے۔ ادھر انہیں دیکھ کر اشفاق کی وحشت کم ہو گئی۔ صرف غم رہ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے بڑھ کر آفاق کا ہاتھ تھام لیا۔ "بھائی جان۔۔۔ اس کالی بلی کو مار ڈالیں۔ اس نے دادا کے چوزی کو مار دیا ہے۔" پھر وہ مشتاق سے لپٹ گیا۔ "بھائی کچھ کریں۔ ہمیں بدلہ لینا ہے۔ دیکھیں دادا کے چوزی کو۔" اب وہ چھوٹا ہو گیا تھا۔ اس کے بڑے جو آ گئے تھے۔

پھر وہی جنون دوسرے بچوں پر بھی طاری ہو گیا۔ ان سب کو کون روک سکتا تھا۔ صرف آمنہ قابو میں آئی۔ تینوں لڑکے کالی بلی کی تلاش میں نکل گئے۔ ثمینہ اور روبینہ ان کے پیچھے بھاگیں۔ بلی کہیں ہوتی تو ملتی۔ بڑی مشکل سے اسکوائر کے بڑے لڑکے ان تینوں کو پکڑ کر اوپر لائے۔

اب وہ چاروں بلک بلک کر رو رہے تھے--- ہائے ہمارے دادا کا چوزی--

"تم لوگ یوں رو رہے ہو تمہیں اپنے دادا کی کوئی فکر نہیں۔" اماں نے بچوں سے کہا۔

"ہم کیا کریں بڑی اماں؟"

"خود کو سنبھالو۔ تمہارے دادا تو تم سے زیادہ روئیں گے چوزی کیلئے، تمہیں اچھا لگے گا۔"

"مگر ہم کیا کریں بڑی اماں؟"

"سب سے پہلے چپ ہو جاؤ۔ چوزی کو نیچے جا کر دفن کر آؤ پھر بتاؤں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟"

دس منٹ کے اندر اسکوائر کی بڑی کیاری میں چوزی کو دفن کر دیا گیا۔ تدفین اس شان سے ہوئی کہ اس میں اسکوائر کے تمام چھوٹے بڑے شریک تھے اور بچوں کا غم دیکھ کر تقریباً سبھی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

تدفین کے بعد بچے اوپر آئے تو اماں نے انہیں پاس بٹھا لیا۔ "دیکھو، تمہیں رونا نہیں ہے۔"

"مگر بڑی اماں رونا خود بخود آ رہا ہے۔" مشتاق نے کہا۔

"اپنے دادا کی خاطر صبر نہیں کر سکتے۔"

"اس سے دادا کو فائدہ ہو گا؟" آفاق نے پوچھا۔

"ہاں---"

"کیسے---؟" مشتاق نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو کہ تمہارے دادا چوزی سے کتنی محبت کرتے تھے۔"

"جی--- ہمارے جتنی۔"

"تو انہیں کتنا دکھ ہو گا وہ کتنا روئیں گے لیکن اگر وہ دیکھیں گے کہ تم صبر کر رہے ہو، رو نہیں رہے ہو تو وہ بھی صبر کریں گے اور نہیں روئیں گے۔"

"لیکن رونے میں کیا حرج ہے؟" آمنہ نے سوال اٹھایا۔

"کوئی بھی روئے گا تو چوزی کی روح کو تکلیف ہو گی۔" اماں نے کہا۔ "کیا تم چوزی کو مرنے کے بعد تکلیف پہنچانا چاہتے ہو؟"

بچوں نے حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھال لیا۔

"اور آتے ہی دادا کو ایک دم سے نہ بتا دینا۔ انہیں تیار کرنا پہلے۔"

"ٹھیک ہے بڑی اماں۔"

○

مرزا نیچے گرے تب بھی ہوش میں تھے۔ ردعمل کے طور پر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھے مگر اتنی دیر میں وہ بہت سے لوگوں کے درمیان گھر چکے تھے۔ سب انہیں سہارا دے رہے تھے۔ کچھ لوگ ٹٹول بھی رہے تھے۔ "کیا حال ہے آپ کا؟" کسی نے پوچھا۔

"میں--- میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مرزا کو کہیں درد کا، کسی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا مگر اسی لمحے انہیں اپنے منہ میں کسی غیر معمولی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے ایک طرف تھوکا--- اور حیران رہ گئے-- وہ ان کی داڑھ تھی۔ انہوں نے داڑھ اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔

انہوں نے پھر تھوکا مگر تھوک میں خون کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے زبان سے خالی جگہ کو ٹٹولا کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔ اسی لمحے دوسری داڑھ سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"کمال ہے-- داڑھ ٹوٹ گئی اور خون بھی نہیں نکلا۔" کسی نے کہا۔

"داڑھ ٹوٹی نہیں، نکلی ہے۔" مرزا نے تصحیح کی۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" کوئی اور بولا۔ "یہ صاحب ٹرالر کی ٹکر کے بعد بھی صحیح سلامت بیٹھے ہیں۔ یہ تو کرشمہ ہے قدرت کا۔ داڑھ بے چاری کی کیا اوقات

ہے۔"

"آپ جا کہاں رہے تھے؟" کسی نے پوچھا۔

"ڈینٹل کلینک۔"

"تو وہ مسئلہ تو یہیں حل ہو گیا۔"

"جی نہیں دوسری طرف کی داڑھ باقی ہے۔ اس میں شدید تکلیف ہے۔"

"ویسے تو آپ ٹھیک ہیں نا؟"

مرزا نے چل کر دیکھا خود کو ٹٹولا کہیں ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ بس ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ اتنے بڑے حادثے کا فطری ردعمل تھا۔

"چلئے، ہم آپ کو کلینک تک لے چلیں۔"

○

ڈاکٹر نے واقعہ سنا، بے یقینی سے نکلی ہوئی داڑھ کو دیکھا پھر داڑھ کی جگہ کو ٹٹولنے لگا۔

"اچھی طرح دیکھ لیں اس کی جڑ یا کوئی ٹکڑا اندر تو نہیں رہ گیا۔" مرزا نے کہا۔

"جی نہیں۔ داڑھ صفائی سے نکلی ہے۔ آپ کہتے ہیں، خودبخود نکلی ہے اور خون بھی نہیں نکلا۔" ڈاکٹر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"یہ سچ ہے۔"

"بہرحال آپ اس کی فکر سے تو آزاد ہو گئے۔ اب میں دوسری کو دیکھتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے ہلتی ہوئی داڑھ کو اسٹیل کے اوزار سے چھوا تو مرزا کی چیخ نکل گئی۔

"یہ بھی نکالنی پڑے گی، ختم ہو چکی ہے۔" ڈاکٹر نے بے پروائی سے کہا۔

مرزا کے بس میں ہوتا تو بھاگ کھڑے ہوتے مگر اس وقت ڈاکٹر کے شکنجے میں تھے۔ "میں تکلیف سے بہت ڈرتا ہوں ڈاکٹر صاحب!" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تکلیف ہو گی ہی نہیں۔ انجکشن سے ایسا سن ہو جائے گا کہ آپ کو پتہ بھی

نہیں چلے گا۔" ڈاکٹر نے انہیں دلاسا دیا۔

اب وہ ڈاکٹر کو کیسے بتاتے کہ انہیں تو انجکشن سے بھی ڈر لگ رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بہت لمبی سرنج میں سیال بھرتے دیکھتے رہے۔ اس سرنج کا سائز انہیں دہلائے دے رہا تھا مگر ڈاکٹر نے مسوڑھے میں سوئی اتاری تو انہیں پتہ بھی نہیں چلا۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ ڈاکٹر اب دوسری سرنج بھر رہا تھا۔

دوسرا انجکشن بلا ثابت ہوا۔ ڈاکٹر نے مسوڑھے میں سوئی اتنی گہری اتاری کہ وہ ہلتی ہوئی داڑھ سے جا ٹکرائی۔ تکلیف ایسی تھی کہ مرزا کو چکر آ گئے۔ سرنج خالی ہوتے ہوتے ان کا برا حال ہو گیا۔ "یہ داڑھ نکلنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔" انہوں نے ڈاکٹر سے بمشکل شکایت کی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ بغیر سن کئے داڑھ نکالی جائے تو آدمی تکلیف کی شدت سے مر بھی سکتا ہے اور دوا اندر داڑھ تک پہنچانا ضروری تھا ورنہ پوری طرح سن نہیں ہو پاتا۔" ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

پانچ منٹ بعد ڈاکٹر نے دوبارہ انہیں منہ کھولنے کو کہا۔ اس بار انہیں داڑھ نکلنے کا واقعی پتہ نہیں چلا۔

دس منٹ بعد وہ کلینک سے باہر آ گئے۔ ٹیکسی ملنے میں انہیں دیر لگی لیکن وہ تہیہ کر چکے تھے کہ ٹیکسی کے بغیر نہیں جائیں گے۔ بالآخر ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر انہوں نے حادثے کے بارے میں سوچا، داڑھ کے بارے میں اور دوسری داڑھ کے بارے میں سوچا۔ ایک داڑھ اللہ کے حکم سے نکلی تھی اور اس میں خون کا ایک قطرہ نہیں نکلا تھا اور ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ دوسری داڑھ ڈاکٹر نے نکالی تھی اور تکلیف سے بچانے والے انجکشن نے انہیں اتنی تکلیف پہنچائی تھی کہ وہ نڈھال ہو گئے تھے۔ پھر خون بھی نکلا تھا اور تکلیف اب تک ہو رہی تھی۔

اچانک ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "اے اللہ۔۔۔ آپ کی ہر عنات میں شکر کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں۔" انہوں نے دل میں کہا۔ "میں آپ کی عنایت کا ترتیب کے مطابق شکر ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ قبول فرما لیں۔ اے اللہ میں اس حادثے پر آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس میں میری ایک بہت بڑی تکلیف بغیر کسی

تکلیف کے دور ہوگئی۔ اے اللہ، میں جانتا ہوں کہ اس حادثے میں میری دوسری داڑھ بھی نکل جاتی تو میں آپ کی عنایت کو کبھی سمجھ نہ پاتا۔ کبھی شکر ادا نہ کرپاتا اور اے اللہ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اتنے خطرناک حادثے میں مجھے خراش بھی نہ لگنے دی جبکہ میں اس میں اپاہج بھی ہو سکتا تھا اور مر بھی سکتا تھا۔ آپ کا شکر ہے میرے کریم، میرے رب رحمٰن۔ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب ان کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

○

مرزا کو گھر پہنچے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ چاروں بچے ان کے پاس ان سے چپکے بیٹھے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ خاموش بیٹھے تھے اور ان سے نظریں بھی چرا رہے تھے۔ اس خاموشی کو اب آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ "کیا بات ہے؟ تم لوگ بہت چپ ہو؟" انہوں نے کہا۔

چاروں بچوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مشتاق نے کہا۔ "دادا۔۔ میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"بتاؤ بیٹے۔"

"اور وہ بات ایسی ہے دادا کہ اسے سن کر شاید آپ بہت روئیں گے۔"

مرزا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جو ڈبڈبا رہی تھیں۔ باقی بچوں کا بھی یہی حال تھا۔ مرزا کے سینے میں فہم اور آگہی کا ایک چراغ روشن ہو گیا۔ انہوں نے خودبخود سب کچھ جان لیا۔ اگر حادثے کا شک نہ ہوتا تو شاید وہ پہلے ہی سمجھ چکے ہوتے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اسے تو آتے ہی ان سے چپک جانا چاہیے تھا۔ تو بات یہ ہے کہ چوزی اب نہیں رہا۔

انہوں نے سمجھا اور ایک پل میں فیصلہ بھی کر لیا کہ انہیں دکھ چھپانا ہے۔۔ آنسو پینے ہیں۔۔ ان ننھے بچوں کی خاطر۔

بچے انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے چاروں بچوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر خود سے لپٹا لیا۔

"تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں میرے بچو!" انہوں نے کہا۔

"اچھا تو ہمیں بھی بتائیں۔"

"میرا، تمہارا چوزی مرچکا ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

جواب میں کوئی آواز نہ نکلی۔ صرف چار ننھے ننھے سر ہلے۔ مرزا کو ترس آنے لگا۔ بچے خود کو رونے سے روک رہے تھے۔

دو تین منٹ گزرے تو بچوں نے خود کو پھر سنبھال لیا۔ "آپ کو کیسے پتہ چلا دادا؟" آفاق نے پوچھا۔

"جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں بیٹے تو اس کے دکھ، اس کی ہر بات کا پتہ چلتا رہتا ہے۔" مرزا نے لہجے کو دکھ سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔

"آپ روئیں گے تو نہیں دادا؟" اشفاق نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔" مرزا نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں چوزی کی روح کو تکلیف تو نہیں پہنچاؤں گا۔"

اب اشفاق تفصیل سنانے لگا۔ مرزا سنتے رہے۔ کارنر کا گرنا۔۔۔ انہوں نے کارنر کی طرف دیکھا ٹائم پیس کو دیکھا کوئی چیز ان کے ذہن میں چبھی مگر اس وقت وہ کچھ سمجھنے کے قابل نہیں تھے۔

بچے تفصیل سناتے رہے لیکن نجمہ بیگم نے انہیں ہٹا لیا اور مرزا کو تنہا چھوڑ دیا۔ مرزا چوزی کے متعلق سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ سوچتے تو رونا آتا اور وہ بچوں کے سامنے رونا نہیں چاہتے تھے مگر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چوزی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ تو چوزی مرگیا، اب کون میرے کان میں گدگدی کر کے مجھے جگائے گا۔ اب کون میرے پیچھے سائے کی طرح لگ کر چلے گا۔ نماز کے بعد دعا کے وقت کون میری گود میں چڑھ کر بیٹھے گا۔ کون دوزانو بیٹھ کر تلاوت قرآن پاک سنے گا۔ میرا تو وہ ہر پل کا رفیق تھا۔

انہیں احساس ہوا کہ اب وہ رو پڑیں گے۔ انہوں نے فوراً سوچ کا رخ بدلا۔ اسی لمحے اماں ان کے پاس آ بیٹھیں۔ "منے تجھے دکھ تو بہت ہو گا مگر خود کو سنبھال رکھنا۔"

مرزا یہ سن کر بھی رو سکتے تھے، انہوں نے جلدی سے کہا۔ "ارے بھئی خبروں کا وقت نہیں ہوا۔" یہ کہہ کر انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔۔۔ اور

دیکھ کر حیران رہ گئے۔ گھڑی میں چھ بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ یہ احساس انہیں چند لمحے بعد ہوا کہ گھڑی ٹھہری ہوئی ہے لیکن کیوں؟ اوہ۔۔۔ ٹرالر کی ٹکر سے جو وہ اچھل کر گرے تھے تو شاید اس جھٹکے سے گھڑی بند ہو گئی تھی۔ شاید نہیں یقیناً یعنی حادثہ چھ بج کر پچاس منٹ پر ہوا تھا۔

"اور یاد رکھو منے، پالتو جانور اپنے مالکوں کے جان و مال پر قربان ہو جاتے ہیں۔ خودبخود صدقہ ہو جاتے ہیں۔"

مرزا یہ سب کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

"وقت کیا ہوا ہے آخر؟" وہ جھنجھلا کر بولے۔ انہوں نے کارنر پر رکھی ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔۔۔ دردناک آواز میں۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

ان کو روتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔ بڑے پریشان ہو گئے۔ اماں مرزا کی پیٹھ تھپکتی رہیں۔ "یہ کیا بچپنا ہے منے، ایسا نہ کر۔"

مرزا روتے روتے رکے۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں پالتو جانور قربان ہو جاتے ہیں مالک پر۔" انہوں نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ "اماں۔۔۔ میرا چوزی مجھ پر قربان ہو گیا۔ وہ میری جان کا صدقہ بن گیا اماں۔ اماں میرا چوزی مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ مجھ پر قربان ہو گیا۔"

کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مرزا پھر بلک بلک کر رو رہے تھے۔ وہ کیسے بتائیں ان سب کو۔ ان کی نظر اٹھی اور کارنر پر رکھی ٹائم پیس پر ٹھہر گئی۔ اس ٹائم پیس نے ہی انہیں سب کچھ سمجھایا تھا۔ بلی کے جھپٹنے کے نتیجے میں کارنر گرا تھا۔ ٹائم پیس گری تھی اور بند ہو گئی تھی۔ وہ ٹائم پیس کو دیکھتے رہے۔ اس میں چھ بج کر پچاس منٹ کا وقت نظر آ رہا تھا۔